ادب کا مقصد

مصنف کی دوسری کتابیں

۱۔ کلیاتِ ولی	(طبع ثانی)	۱۹۴۵ء
۲۔ سیاسی نظریے		۱۹۴۶ء
۳۔ دلّی کا دبستانِ شاعری		۱۹۴۹ء
۴۔ ناول کیا ہے	بہ شرکت ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	۱۹۵۱ء
۵۔ کلیاتِ ولی	(طبع سوم)	۱۹۵۴ء
۶۔ ترجمہ کنیڈڈا		۱۹۵۴ء
۷۔ ایک نادر روزنامچہ		۱۹۵۴ء
۸۔ ادب کیا ہے؟		۱۹۵۶ء
۹۔ نوطرزِ مرصع		زیرِ طبع

ادب کا مقصد

از

(ڈاکٹر) سید نورالحسن ہاشمی

ناشر

ہندوستان کتاب گھر
لکھنؤ

پاکستان

ملنے کا پتہ

مبارک بک ڈپو

بندر روڈ۔ مقابل ڈینسو ہال۔ کراچی ۲

قیمت

بار اول — سرفراز قومی پریس لکھنؤ — ۱۹۵۶ء

اپنے احباب کے نام

ترتیب

تعارف

یوں تو میرا سب سے پہلا مضمون نگار کے ستمبر ۱۹۳۱ء کے شمارہ میں نکلا تھا لیکن باقاعدہ مضامین لکھنے کی نوبت ۳۹ء سے آئی۔ اُس وقت سے اب تک جو مضامین لکھے گئے ان کا ایک انتخاب یہاں پیش کیا جا رہا ہے، ذوق اور مومن پر جو مضامین ہیں اُن میں تو اُن کی شاعرانہ خصوصیات کا ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے اقبال کے یہاں سے صرف اُن کے ایسے کلام کو منتخب کیا گیا ہے جس میں انھوں نے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کی طرف اشارے کیے ہیں اور اس بارے میں جو اُن کے خیالات ہیں انھیں تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ غالب کی قدر کے سلسلے میں ممکن ہے کہ بعض لوگ میرے خیال سے اتفاق نہ کریں کیونکہ میں غالب کی شاعرانہ عظمت کا جس قدر قائل ہوں اتنا اُن کی شخصیت کا نہیں، میرے خیال میں غالب کی طبیعت میں اُن کے پہلے معنوی استاد بیدل کی سی قناعت نہ تھی۔ وہی بیدل جن کے کم از کم یہ دو شعر آپ نے سُنے ہوں گے ؎

دنیا اگر دہند نہ خیزم ز جائے خویش
من بستہ ام حنائے قناعت بہ پائے خویش

یا

در ہائے فردوس وا بود امروز
از بے نیازی گفتیم فردا

اپنے خاندانی اور نسلی خصوصیات کے تحت غالب نے ایک شاہانہ یا عیش امروز والا دل و دماغ پایا تھا۔ ان میں قناعت طبعاً نہیں تھی اگر کہیں ظاہر بھی ہوئی ہو تو وہ قال ہے حال نہیں، اگر وہ عشرت سے گزر کرنے کی فکر میں نہ ہوتے تو غالباً ان کی تنخواہ اور دیگر فتوح سے اُن کی گزر اوقات بفراغت ہو سکتی تھی یہ ضرور ہے کہ مادی طور پر اُن جیسے شاعر کی قدر نہیں ہوئی لیکن ان کی شہرت تو کسی طرح کم نہ تھی۔ ان کی

ہندوستان میں کیسی ہوگی، تو یہ ظاہر ہے کہ اگر اردو زبان یہاں باقی رہی تب تو اُن کی قدر کا سوال اٹھے گا ورنہ نہیں۔ ابھی جو مرزا غالب نامی فلم بنا تھا اور جس پر حکومت ہند سے پہلا انعام بھی ملا تھا یہاں لکھنؤ کے ایک سینما ہال میں یہ حالت تھی کہ لوگ غالب کے بہت صاف اور سیدھے اشعار کا مطلب بھی ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے افسوس کہ اب لوگ فارسی کی معمولی اضافتیں بھی بھولے جا رہے ہیں۔

واجد علی شاہ کے جو خطوط اس مجموعے میں پیش کئے جا رہے ہیں وہ غیر مطبوعہ ہیں اور اتفاق سے میرے ہاتھ آگئے تھے۔ اردو خطوط نویسی میں واجد علی شاہ کے خطوط یقیناً جو مقام رکھتے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے امید ہے کہ یہ خطوط ضرور اہم سمجھے جائیں گے۔

علم عروض کو صوتی انداز میں پیش کرنے کا تجربہ شاید کچھ نیا معلوم ہو یہ انگریزی عروض کے طریقے پر ترتیب دیا گیا ہے اس سے طلبا کو یا ان حضرات کو جو علم عروض سمجھنا چاہتے ہیں یقیناً آسانی ہوگی اور اس کے مطالعہ کے بعد وہ عروض کے دیگر پیچیدہ نکات کو اس فن کی مستند کتابوں سے بخوبی سمجھ سکیں گے۔ اس مضمون کو اس فن کا محض نیا تعارف سمجھنا چاہیے۔

"ادب کا مقصد" میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی میں جو جھگڑا ہے وہ بے کار سا ہے دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے ادب برائے ادب کا مقصد اگر حسن آفرینی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے بغیر کوئی ادب ادب ہی نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ حسن آفرینی مقصد بالذات نہ ہونا چاہیے یا اسے آخری منزل نہ شمار کرنا چاہیے بلکہ ایک ادیب یا شاعر کو اسے صرف پہلا زینہ سمجھنا چاہیے یعنی اسے وہ محض مشقِ سخن سمجھے اور پھر جب حتی الوسع اس فن پر عبور حاصل کرے تو پھر وہ چیزیں پیش کرے جو زندگی میں اہم قدر و قیمت رکھتی ہیں کیونکہ بغیر زندگی کے تاروں کو چھوئے کوئی ادب یا ادب پارہ جاندار اور پائدار نغمہ پیش نہیں کر سکتا۔

نور الحسن ہاشمی
لکھنؤ یونیورسٹی

۱۲ راکتوبر ۱۹۵۶ء

ادب کا مقصد

آدمی کی زندگی مرکب ہے جذبات و احساسات، ذکر و فکر، ہوش و خبر، نیت و اعمال سے، لیکن ادب کا بنیادی تعلق محض جذبات و احساسات سے ہے۔ جذبات و احساسات سے متاثر ہونے یا ان کو متاثر کرنے ہی کا نام ادب ہے۔ یہ تعلق اسقدر عام ہے کہ اس کی کچھ زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں۔ جب زندگی اور ادب کا تعلق اسقدر معروف ہو تو ادب کا مقصد متعین کرنے سے پہلے ہمیں زندگی کا مقصد متعین کرنا ہوگا۔

زندگی کا مقصد اصلی بقائے زندگی ہے۔ بقائے زندگی کے معنی ہیں کہ زندگی کو کسی نہ کسی طرح برقرار رکھا جائے۔ زندگی ایک تو ذاتی اور انفرادی حیثیت رکھتی ہے دوسری بنی نوع کی یا جماعتی حیثیت۔ بعض جگہ ذاتی زندگی کو برقرار رکھنے کا نام ہی جماعتی زندگی کو برقرار رکھنا ہے۔ یعنی صرف "جیو" پر زور دیا جاتا ہے اور بعض جگہ خصوصاً مشرق میں جماعتی زندگی کو برقرار رکھنا فرضِ اولین سمجھا جاتا ہے اور اسی میں فرد کی زندگی کا قیام سمجھا جاتا ہے یعنی "جیو" سے پہلے "جینے دو" پر زور

دیا جاتا ہے۔

بقائے زندگی ممکن کیونکر ہے؟ فطرت کے پاس اس کا صرف ایک طریقہ ہے یعنی تخلیق، مسلسل تخلیق، موت سے اسے کوئی واسطہ نہیں یہ مسلسل تخلیق کئے جاتی ہے بے تکان اور بڑی شد و مد سے اس شغل میں مصروف رہتی ہے، کوہ و صحرا۔ قطرہ و دریا۔ آبادی و ویرانے، خشکی و تری کہاں یہ مصروفِ کار نہیں۔ ایک آبشار کے مانند جلالی و جمالی شان کے ساتھ یہ حیات ہر جگہ رواں دواں، موجود اور مصروف نظر آتی ہے۔ ہم لوگ اس طریقۂ تخلیق کو "جنسیت" کی اصطلاح سے نامزد کرتے اور سمجھتے ہیں۔ یہی جنسیت ہمارے ادب میں کہیں فلسفۂ محبت کا بلند بانگ نام اختیار کرتی ہے۔ کہیں محض جرائتِ رندانہ کہلاتی ہے! لیکن فطرت کی یہ کارروائیٔ تخلیق اس کی اپنی ہے۔ ہماری نہیں۔ ہم اس کے ہاتھوں مجبورِ محض ہیں لیکن ہمیں اختیار اس وقت ضرور مل جاتا ہے جب ہم تخلیق میں آجاتے ہیں۔ اس وقت ہم کم از کم اتنے تو بااختیار ہو جاتے ہیں کہ اس زندگی کو اپنے قالبِ خاکی میں برقرار رکھ سکیں۔ کم از کم اتنے عرصہ تک جبتک اس مستعار قالب میں باقی رہنے کی سکت ہے یا جس حد تک اس مستعار قالب کی وہ لیاقت اس قابل ہیں کہ برقرار رکھی جا سکیں۔ اس لئے ہم کوشش اسی کی کرتے رہتے ہیں کہ اپنی زندگیوں کو زیادہ سے زیادہ عرصہ تک اور زیادہ سے زیادہ بہتر صورتوں میں برقرار رکھیں اسی کوشش کا دوسرا نام "تمدنی تاریخ" ہے اور اسی جد و جہد کی آخری منزل کا نام

"جنت" ہے۔

ان حیاتی اور سماجی اصولوں کی تشریح کے بعد انسان کی جذباتی اور حسی کیفیتوں کے اصولوں پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ جن کا تعلق براہ راست ادبیات سے ہے۔ انسان کی جذباتی اور حسی زندگی بھی چند اصولوں کے مطابق کٹتی ہے۔ یہ اصول اُن جذباتی اور نفسیاتی تجربوں کو پیشِ نظر رکھ کر بنائے گئے ہیں جو ہماری زندگی میں ضرور پیش آتے ہیں۔ اور اب بمنزلہٗ قوانین کے ہوگئے ہیں اصطلاح میں انھیں اصول نفسیات کہا جاتا ہے۔ اِن اصولوں میں سے ایک بنیادی اصول خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

انسان ہر حالت میں برتر رہنا چاہتا ہے۔ یہ خودی یہ رفعت اور برتری کی خواہش ایک ایسی بنیادی جبلت ہے جو ہر جگہ ہر دل میں اور ہر ذی روح میں کارفرما ہے۔ ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کا طلسم رنگین اور دنیا کی ہماہمی اسی خلشِ برتری کی رہین منت ہے۔ انسان ہر حالت میں برتر رہنا چاہتا ہے، وقتی مجبوریوں کی اور بات ہے، جسے مصلحت کہہ لیجئے ورنہ خوشی سے کوئی انسان اپنے کو حقیر سمجھنا کبھی نہیں چاہتا۔ ہر نفس میں یہ کاوش ہر لمحہ موجود رہتی ہے۔ ہماری کش مکش۔ جدوجہد نعرہ ہائے ہاؤ ہو۔ سب اسی کی وجہ سے قایم و دائم ہیں چنانچہ آدمی جب زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اس کی انفرادی خودی دوسرے لوگوں کی خودی سے ٹکراتی ہے۔ اگر وہ کامیاب ہوگیا تو فخر و مباہات کا

تسکین پذیر جذبہ اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر ناکامیاب رہا تو اِس احساسِ کمتری پر غم و غصہ، رشک و حسد کے جذبات بیدار ہوجاتے ہیں۔ لیکن اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ جب آدمی ناکامیاب رہتا ہے تو اسے اپنی ناکامیابی تسلیم نہیں کرتا۔ اور اس احساسِ شکست کو بھلا دینا چاہتا ہے۔ کیونکہ اِس سے اُس کے احساسِ برتری کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور نفس اس خاص وجہِ تکلیف سے فرار ہوکر دوسرے میدانوں میں سرگرمِ کار ہوجاتا ہے۔ اس خاص صورت کو علمِ نفسیات میں گریز کہتے ہیں۔ گریز کی مختلف شکلیں ہیں۔ لیکن عام طور سے جو شکل نفس اختیار کرتا ہے وہ یہ ہے کہ غمِ روزگار بھلایا جاتا ہے شاہد و شراب میں۔ ع

جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

یا

در دلِ ما غمِ دنیا غمِ معشوق بود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما
(عرفی)

تمام دنیا کی شاعری کا عموماً اور ایشیائی شاعری کا خصوصاً بیشتر حصہ اسی قاعدے کے تحت وجود میں آتا رہا ہے اور جس کی بہترین مثالیں حافظ اور خیام کی شاعری میں ملتی ہیں۔

کبھی یہ غمِ روزگار بھلایا جاتا ہے تصوف اور روحانیت میں۔ دنیا کی شاعری کا ایک معتدبہ حصہ اسی جذبے کے تحت ظہور میں آیا ہے، عطار، رومی، سنائی، ٹیگور، مارکس عوریلیاس کے ملفوظات اس کی نمایاں

مثالیں ہیں۔ ہماری اُردو شاعری میں دردؔ اور راسخ عظیم آبادی اس صفت میں مشہور ہیں، ورنہ اس موضوع کے اچھے اشعار ہمارے دیگر اچھے شاعروں کے ہاں بھی بیشتر ملتے ہیں۔

مزاجوں میں یاس آ گئی ہے ہمارے
نہ مرنے کا غم ہے نہ جینے کی شادی (میر)

گر تجھ کو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ (غالب)

غیر معمولی حالتوں میں نفس اگر ان دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی اختیار نہیں کرتا یا کسی طرح سے اپنا غم غلط نہیں کرتا۔ (کسی طرح اس کا ماتم نہیں کر لیتا جیسے سوداؔ نے شہر آشوب لکھ کر گیا) تو ناکامیابی کے غم و غصہ میں اس کے لئے سوائے موت کے اور کوئی صورت رہائی کی نہیں رہ جاتی۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ "گریز" بھی نیند کی طرح زندگی کی بقا کے لئے ازحد ضروری اور ایک بالکل فطری چیز ہے۔

اب ادب کیا ہے اس کی بھی اجمالی تشریح یا تعریف کرنی لازم ہے ادب وہ سخنہائے گفتنی یا شنیدنی ہیں جو اپنی موضوع کی جدت اور ندرت یا حسن بیان کی چمک کے باعث لائقِ کشش ہوتے ہیں۔ یا ادب نام ہے کسی حقیقت کے حسین ترین اظہار کا۔ ادب ایک چمکتا ہوا سورج ہے جس میں حرارت اور چمک دونوں ہونا ضروری ہیں۔ بعض اوقات لوگ محض چمک ہی سے مسحور ہو جاتے ہیں لیکن سچا اور پائدار ادب وہی ہے

جسمیں حرارت بھی ہو۔ ورنہ خالی چمک دمک چاند کی روشنی کی طرح محض خالی اور شرارہ کی چمک کی طرح وقتی ہوتی ہے۔ حرارت کا تعلق ادیب کے دل ودماغ سے ہوتا ہے۔ چمک یا حسن کا تعلق اس کے فن سے۔ لیکن یہاں ہمارا موضوع اس کے دل ودماغ سے وابستہ ہے۔ اسلئے حسن یا فن کاری پر گفتگو یہاں خارج از بحث ہے۔

ادیب کے دل ودماغ کا غیر معمولی حالت میں ہونا ادب کی تخلیق کے لئے اول شرط ہے۔ کیونکہ جذبات اور احساسات میں ہیجان یا غیر معمولی سکون اسی وقت پیدا ہوگا جب انسان کی ذہنی کیفیت غیر معمولی ہو اور اس وقت اس کے نطق سے جو فشار ہوگا وہی ادب کہلائے گا۔ انسان کے ذہن کی غیر معمولی کیفیت اسی وقت ہوتی ہے جب اس کا ذہن محسوس کرے کہ دنیا اسکے حسب منشا نہیں چل رہی ہے، انفرادیت اسی وقت بیدار ہوتی ہے جب رکاوٹیں اور مشکلیں اس کی راہ میں حائل ہوجائیں۔ ذہن کو اپنی برتری کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب یہ دقتیں اس کی راہ میں مزاحم ہوں اسے کوئی سخت روحانی تکلیف ہو اور وہ ذہنیت اس وقت اپنے کو کمزور سمجھے یا سمجھنے پر مجبور کی جائے تو اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادیب ایک کمزور آدمی ہوتا ہے یا اس وقت کمزور ہوتا ہے جب وہ ادیب ہوتا ہے۔ طاقتور آدمی کو نہ ادب کی ضرورت ہوتی ہے نہ ادبیات کے لئے فرصت، ایک طاقتور آدمی ایک ادیب ہو سکتا ہے لیکن صرف اپنی فرضی یا واقعی کمزوری کے لمحات ہیں۔ ہر بظاہر کمزور لیکن بہ باطن طاقتور

یعنی غیر معمولی ذہن کا آدمی البتہ ہر وقت ادیب ہو سکتا ہے۔ کردار کا غازی نہ شاعری کرتا ہے نہ ادب پیش کرتا ہے اس کے لئے لذّت کامیابی اس کے دل و دماغ میں غیر معمولی انتشارِ جذبات پیدا نہیں کرتی وہ لذت اُس کے لئے معمولات میں سے ہے لیکن شکست کے لمحات میں شکست کی ذہنیت سے بچنے کے لئے ذہن ردِ عمل کے طور پر تفریح کا سہارا ڈھونڈھتا ہے۔ فنونِ لطیفہ کی پیدائش اسی کیفیت کے تحت ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ ادب نام ہے حقیقت سے گریز کا۔ خواہ یہ گریز وقتی ہو یا مستقل،

تو گویا "گریز" کی دو قسمیں ہوئیں۔ ایک گریز وہ جو محض برائے گریز ہو۔ فرار برائے فرار، ایک گریز وہ جو قوت حاصل کرنے کے لئے کیا جائے۔ جسے ہم "ہجرت" کہتے ہیں۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے ہجرت کا درجہ گریز سے کہیں زیادہ اونچا ہے۔ کیونکہ یہ قوتِ حیات حاصل کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔ تاکہ آدمی تروتازہ اور توانا ہو کر پھر زندگی کی کشمکش کو سر کرنے کے قابل ہو جائے۔ لیکن فرار برائے فرار بھی نفسیاتی حیثیت سے بالکل فطری اور ضروری ہے کیونکہ یہ بھی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے غیر شعوری طور پر ہوا کرتی ہے اور اگر ادب برائے ادب سے مطلب فرار برائے قیامِ زندگی ہے تو ظاہر ہے کہ ایسے ادب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا نفسیاتی طور پر ایسی گریز بالکل بجا اور فطری قرار دی جائے گی، اس لئے لائق مذمت نہیں۔ اگر ادب برائے ادب سے مطلب محض ادب برائے فن یا بتانے کے

حسنِ بیان ہے تو ظاہر ہے کہ ایسا ادب بیکار محض ہے۔ جس سے بیان سروکار نہیں۔ ادب برائے زندگی کا مطلب وہ ہوگا جسے یہاں ہجرت برائے زندگی کہا گیا ہے اور جس طرح ایک نفسیاتی مریض کے لئے اخلاقی طور پر یہ ضروری ہوتا ہے کہ اسے صحت بخشی جائے، فرار کی صورت کو ہجرت اور ہجرت کو حقیقت پژوہی میں تبدیل کر دینا ادبیات میں بھی اخلاقی نقطۂ نظر سے ایک سعی مستحسن ہوگی۔ لیکن جنون کی حالت میں بھی اگر ذہن بے راہ رو نہ ہو بلکہ اپنے نفس کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جائے تو ایسا جنون، ایسا فرار ادبیات کے لئے ایک ابدی کارنامہ ہوگا۔ دنیا کے تمام مشاہیر ادیبوں کے شہپارے اسی "فرار" کے مرہونِ منت ہیں۔

اس نفسیاتی اور اخلاقی بحث کو ختم کرنے سے پہلے آئیے ادبیات کو عموماً اور اردو ادب کو خصوصاً مثال کے طور پر نظروں کے سامنے رکھ لیں۔

جب سے آدمی نے تمدن اختیار کیا ہے اس کی تاریخ میں بہت کم زمانے ایسے گزرے ہیں کہ آدمی آدمی کا غلام نہ رہا ہو...... سامراجیت نے ذہنِ انسانی کو تقریباً ہمیشہ غلام رکھا۔ اس لئے اعلیٰ دل و دماغ کی صلاحیت اور اعلیٰ ذہن رکھنے والوں کو اپنی مادی زندگیوں میں گریز کے موقعے پیش آتے رہے اور کثرت سے پیش آتے رہے اور زندگی کی خاطر ان کے افکار اس ذہنی کش مکش سے نجات پانے کے لئے رنگین خیالی اور رنگین بیانی میں منتقل ہو کر شعر و ادب کا سرمایہ بنتے رہے۔ شاہد و شراب میں محو ہو جانے کے علاوہ یہ لطف انبساط یا افکارِ غم مجاز سے بلند ہو کر

حقیقی شراب وشاہد کی طرف ہی سجدہ ریز ہوتا رہا۔ اور اپنے لیئے عمل، زندگی اور اخلاقیات کے مخصوص نصاب ان مخصوص حالات میں بناتا رہا دوسرے الفاظ میں مخصوص سیاسی حالات بخصوص ادبی اور اخلاقی پیداوار پیش کرتے رہے۔

اپنے اُردو ادب کے شعری اور ادبی کارناموں پر نظر ڈالیئے اس کو بھی اس کے سیاسی پس منظر میں دیکھئے تو یہ بات نمایاں ہو جائے گی۔ اُردو شعر وادب نے جب یہاں جنم لیا تو ہندوستان میں شاہی یا شہنشاہی دور عرصے سے چلا آرہا تھا۔ سامراجیت میں جیسا کہ بیان ہو چکا ہے فرد واحد اتنا آزاد اور مختار نہیں ہوتا جتنا کہ جمہوریت میں۔ ایسی غلامانہ ذہنیت کے دور میں جو اعلیٰ دل ودماغ پیدا ہوگا اگر وہ دربار سے وابستہ نہ ہو سکا تو پھر محرومیٔ قسمت کے گلے کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں یا تو ذہنی عیاشی پیدا ہو جائے گی یا تصوف اور رواقیت کا پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ دنیا کا وجود اسے محض اعتباری معلوم ہوگا رئیسوں کی ریاست اور امیروں کی امارت پر اُسے رشک نہ آئے گا۔ بلکہ وہ سمجھ لے گا کہ یہ بھی انقلابات دہر کا ایک تماشا ہے ؎

کیا اعتباریاں کا کل اُس کو خوار دیکھا
جس نے جہاں میں آکر کچھ اعتبار پایا (امیر)

مثال کے طور پر میر ہی کی شاعری کو دیکھ لیجئے۔ زمانہ کی حالت ابتر اپنی اوقات خراب، حالت درویشانہ، مزاج شاہانہ، چنانچہ اس کا دل ودماغ بے چارگی وبے لبسی کے سمندر میں ڈوب کر رہ گیا۔ کوئی شعر دیکھ لیجئے رواقیت

اور یاسیت سے لبریز نظر آئے گا۔

جو پوچھا کہ کتنا ہے گل کا ثبات　　کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

اپنی تو یونہی گذری، یا رو دیئے یا رلایا

کیا ذکر ہم صفیرو یارانِ شادماں کا

جہاں سے دیکھئے یک شعرِ شور انگیز نکلے ہے

قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں

اور یہ صرف میر ہی تک محدود نہیں اس عہد کا ہر شاعر رواقیت اور بیچارگی کے اسی اعصابی اضمحلال یا صوفیانہ اعتدال میں مبتلا نظر آئے گا۔ درد اور قائم کے ہاں بھی یہی درد قایم ہے۔ میر حسن قصہ اور کہانی میں جی بہلاتے ہیں۔ سودا طرح طرح سے چیختے ہیں۔ کبھی شہر آشوب لکھتے ہیں کبھی ہجویں۔ کبھی شاہوں کی طرف دامن پھیلاتے ہیں کبھی ائمہ کی طرف۔ غرضکہ۔

سب ماحصل اِن باتوں کا اک بارِ جہاں ہے

دوسرا دور انشا، مصحفی اور جرأت کا آتا ہے۔ یہ لوگ بادشاہوں کی مصاحبت سے اپنا پیٹ پالتے ہیں اور باوجودیکہ صاحب علم و فضل ہیں لیکن کیا کریں اپنے فضل و کمال کو ڈبوتے اور غم دنیا کو بوالہوسی، رندی اور چوما چاٹی کے تصور میں بھلائے رکھتے ہیں۔

غالب اور مومن کا زمانہ آتا ہے۔ ذوق اور شاہ نصیر تو خیر سے ادب برائے ادب میں خود کو کھو دیتے ہیں۔ مومن عشقِ پردہ نشیں ہی میں محو ہو جاتے ہیں۔ غالب با این قوتِ نظر و توانائیِ فکر آخر دم تک فکرِ روزگار

میں دیوانے رہتے ہیں اور آخر کار رواقیت میں پناہ لیتے ہیں ؏

دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا وچہ دیں

۱۸۵۷ء کا انقلاب سیاست ومعیشت کے ساتھ ذہنیت میں بھی ایک انقلاب برپا کرتا ہے۔ سامراجی حکومت تو انگریزوں کا بھی مطمح نظر ہے لیکن ان کی جادوگری کے طریقے دوسرے ہیں اُن کے عہد میں کم از کم زبان وقلم پر اتنی پابندی نہیں رہتی۔ آزادی اور غلامی کے معانی میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے تدبیر اور تقدیر کے حدود میں بھی انقلاب رونما ہوتا ہے۔ یعنی زندگی بسر کرنے کے تمام طریقوں میں بیحد سہولتیں اور آسانیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ ذرائع نقل وحمل تیز سے تیز تر ہوجاتے ہیں۔ پریس کی ایجاد زبانِ قلم کی جنبشوں کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک جلد سے جلد پہونچانے لگ جاتی ہے۔ نقل وحمل کی آسانی اور شہری امن وامان کے باعث تجارت ملازمت اور اسی طرح زندگی بسر کرنے کے دیگر ذریعوں اور طریقوں میں انتخاب کے مواقع زیادہ ملنے لگتے ہیں۔ انسان کا دل ودماغ اتنا مفلوج اور ہیبت زدہ نہیں رہتا جتنا کہ پیشتر تھا لامحالہ ارباب عقل وہمت میں اتنی آزادی گفتار ورفتار کی بدولت جرأت رندانہ پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ اپنی قوتوں کا جائزہ لیتے ہیں اپنے اسبابِ تنزل پر غور کرتے ہیں اور اپنی ترقی اور اصلاح کے منصوبے باندھنے لگتے ہیں۔ سرسید، حالی، آزاد اور ان کے ہمکار اس بیداری کے علمبردار ہیں یہ لوگ اپنی تحریروں کی بدولت شعروادب کے دریا کو جو

ایک بند جھیل میں محصور ہو گیا تھا دوسری زرخیز وادیوں اور نئے میدانوں میں رواں کر دیتے ہیں۔

مغرب نے اپنے تمدن اور تہذیب کے جہاں نئے معیار اور نئے سکے ہندوستان میں برآمد کیے وہاں شعر و ادب کے نئے خزانے۔ نئے گوہر۔ نئے جواہرات نئے پیمانے اور نئی شرابیں بھی ہندوستان روانہ کیں جن کی مختصراً تفصیل یہ ہے:

مغرب کی سوسائٹی میں فرد مرکز اصلی ہے اور سوسائٹی اسی سے مضبوط ہوتی ہے۔ اس نظریے نے وہاں کے تمدن میں جس طرح فرد کو اولیت اور افضلیت دی ہے اسی طرح شعر و ادب میں بھی اس نے مستحکم جگہ حاصل کی ہے وہاں کا شاعر سامعین کو اپنی نظر کی طرف زیادہ متوجہ کرنا چاہتا ہے مشرق کی طرح خود کو فراموش نہیں کرتا۔ مغرب کا شاعر اپنے لئے شاعری کرتا ہے مشرق انسانیت کے لئے۔ اس کے علاوہ ایک تجارتی اور بحری ملاحوں کی قوم میں جو واقعیت پسندی ہوتی ہے ایک پُر مناظر ملک میں جو روحانی فطرت پرستی ہوتی ہے۔ ایک بے پردہ قوم میں جو شفاف عریانی ہوتی ہے یہ سب وہاں کے شعر و ادب کے ساتھ ہندوستان آئی اور ذریعہ تعلیم انگریزی ہو جانے کے باعث یہاں رائج ہو گئی اور بعض خصائص کو تو یہاں کی آب و ہوا بہت راس آئی خصوصاً انفرادیت اور واقعیت پسندی کو جب حاکم اسی رنگ کا تھا تو پھر محکوم، یہ رنگ کیوں نہ اختیار کرتے۔ قدرتی مناظر پرستی البتہ یہاں زیادہ مقبول نہ ہو سکی اور اس

کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے رہنے والے بیشتر میدانی ہیں ایسے میدانوں کے جن کی یک رنگی بہت سپاٹ اور بے کیف ہے۔

اس واقعیت پسندی نے شعر وادب کا دھارا بالکل موڑ دیا۔ ساتھ ہی سیاسی آزادی کے بڑھتے ہوئے اثرات نے جب مرغ قفس کو مجبور کیا کہ وہ بجائے آشیاں سمجھنے کے اپنے قفس کو قفس سمجھے تو اس کو اپنے قفس کی تیلیاں بھی کمزور نظر آنے لگیں اور چمن کی صاف اور آزاد فضائیں بھی صاف نظر آنے لگیں اور نہ مظہر جان جاناں کی حسرت ؎

یہی حسرت رہی دل میں کہ کیا کیا زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا

اب امید اور آرزومندی سے مبدل ہو گئی خود میں چمن بندی کی صلاحیت محسوس ہونے لگی ؎

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو

یا

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

چنانچہ جب ہمارے ادیبوں کو اپنا گریز بھی گریز نظر آگیا اور جب وہ سمجھنے لگے کہ ہمیں اسے ہجرت کے تخیل میں تبدیل کر دینا چاہیئے تو اقبال جیسا کامیاب واقعیت پسند شاعر پیدا ہو گیا۔ اسی نے ہمیں سب سے

پہلے بتلایا کہ ؎

شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

یا

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

یہی اثرات تھے جن سے ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند ادیبوں کی انجمن کی بنیاد پڑی حالانکہ ابھی اُن میں سے بہتوں کی یہ مزعومہ واقعیت پسندی محض خیالی اور رسمی ہے یعنی جس طرح پُرانے دور میں شاعر بغیر عاشق ہوئے عاشقانہ شعر کہتے تھے اسی طرح بہت سے ترقی پسند ادیب بغیر کسانوں اور مزدوروں کی دنیا اور اُن کی زندگی سے واقف ہوئے کسان اور مزدور کی رسمی شاعری کر رہے ہیں۔ پھر بھی یہ تبدیلی خوش گوار اور صحت افزا ہے اُن میں جو صاحب ادراک ہیں وہ اپنی جگہ مستقل طور پر ضرور بنا لیں گے۔

اس مختصر تاریخی جائزے سے یہ امر بخوبی واضح ہو گیا کہ ہم شاعری یا ادب میں زندگی سے دُور نہیں جا سکتے (سوائے اُن حالتوں میں کہ جہاں شعر گوئی یا ادبیت محض قواعدِ شعری یا لفظی صنعت گری میں محدود اور محصور کر دی جائے) ادب میں اظہارِ شخصیت ہو یا تلاشِ حسنِ کامل، لطفِ انبساط ہو یا فشارِ غم ان کی مزید تحلیل پر حیاتی اور نفسیاتی دونوں نقاطِ نگاہ سے صرف دو صورتیں برقرار رہیں گی یعنی زندگی سے فرار

اور زندگی سے ہجرت۔ دونوں حالتیں زندگی کے لئے مفید ہیں۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے ہجرت کا مرتبہ بلند ہے کیونکہ اس صورت میں انسان زندگی کو اپنے قابو میں لانا چاہتا ہے۔ اپنے اختیار میں کرنا چاہتا ہے اُسے بہتر سے بہتر حالت میں بسر کرنا چاہتا ہے۔ آدمی خود فطرت سے بلند ہو کر فطرت کو قابو میں کرنا چاہتا ہے۔ یقیناً یہ رفعت کی تمنا اخلاقی نظر سے قابل صد ستائش ہے لیکن جب "انا" کمزور ہو جاتی ہے، انسان ضعیف البنیان اپنا ضعف دکھلاتا ہے (اور یہ کب نہیں دکھلاتا؟) تو اس کی زندگی کو سہارا دینے کے لئے وہی بنیادی سوتے کام آتے ہیں جن کی طرف اس کا نفس فرار ہو کر پناہ گزیں ہونا چاہتا ہے۔ اور جن کی شرح و بسط سے دنیا کے ادب اِس قدر مالا مال ہیں (انکی طرف شروع مضمون میں اشارہ کیا جا چکا ہے) کہ ادبیت اور فرار مترادف الفاظ ہو گئے ہیں۔ اخلاقی حیثیت سے ہم کو باخبر ضرور رہنا چاہیئے کہ ہم کس سمت بڑھیں لیکن ادبی نقطۂ نظر سے اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے آدمی کو اپنی نفسی کیفیات کا ڈاکٹر بھی ہونا چاہیئے تاکہ پُرصحت زندگی بسر کر سکے۔ یعنی فن کار کو اپنا نقاد بھی ہونا چاہیئے تاکہ مناسب معیار اور ترقی پذیر فن پیش کیا جا سکے۔ ادبی نقطۂ نظر کہتا ہے نہیں یہ رہرو بننے سے پہلے رہبر بننا ہے خادم بننے سے پہلے مخدوم بننا ہے۔ قصد کار سے پہلے مقاصد کی الجھنوں میں پڑ جانا ہے غرضکہ یہ بحث لا متناہی ہے۔ مختصر یہ کہ اب جبکہ نفسیاتی

طور پر ادب ان دو ہی منزلوں کی طرف رُخ کرتا رہتا ہے اور ایک ادیب کو ساحل کے ان دو کناروں سے مفر ہی نہیں تو اُس کا مقصد کیا بتلائیے سوائے اس کے کہ یا تو یہ تصویریں کھینچے گا یا تفسیریں بیان کرے گا۔ ادب تفسیر زندگی بھی ہے اور تصویر زندگی بھی۔ زندگی میں ہمارے لئے ارژنگ چین کی بھی حاجت ہے اور صحائف آسمانی کی بھی۔ ایک ہماری تفریح طبع کے لئے دوسری ہماری تہذیب طبع کے لئے۔ ادیب کے لئے یہ دونوں ایک ہیں۔ ہاں انسان کے لئے یہ مناسب ہے کہ کفر و اسلام میں تمیز کرتا رہے۔

(نگار جنوری ۱۹۴۶ء)

ملک الشعراء ذوق

غزلیات

ذوق (۱۷۸۶ء۔۱۸۵۴ء) کو آجکل کے معیار سے جانچنا درست نہیں۔ اُن کے عہد میں اُن کی جو قدر و قیمت تھی اسے بھی سامنے رکھنا نہایت ضروری ہے۔ موجودہ معیار کے مطابق ممکن ہے بعض نقاد انھیں شاعر ہی نہ مانیں لیکن اپنے عہد کے وہ بہترین شاعر سمجھے جاتے تھے کیونکہ اُس زمانے کا معیار شاعری دوسرا تھا یعنی شعر میں زبان و بیان کی خوبیاں پیدا کرنا اور اُن پر داد چاہنا۔

کچھ تو استاد شاہ نصیر کی دلّی سے غیر حاضری اور کچھ معرکوں میں دو بدو کامیاب مقابلوں نے ذوق کی شہرت اور شاعری کو جلد چمکا دیا سنگلاخ زمینوں کو پانی کرنا، محاوروں کو اشعار میں نگینوں کی طرح بٹھا دینا اور گرمی کلام کے جوہر دکھانا ان سب باتوں نے بہت جلد لوگوں کے دلوں کو موہ لیا۔ یہانتک کہ خاقانی ہند کے خطاب سے سرفراز کئے گئے۔ اور کم سن ہی تھے کہ بقول آزاد بوڑھے بوڑھے لوگوں نے اپنے اشعار انھیں دکھانا شروع کر دیے۔

اپنے زمانے کے ادبی معیاروں کے لحاظ سے ذوق اپنے عہد کا

بہترین نمونہ کہے جا سکتے ہیں۔ علوم متداولہ عقلی و نقلی میں ماہر ہونا اور بحور و اوزان پر کامل قدرت حاصل کر لینا اُس زمانے کے شاعر کی اولین خصوصیات اور ضروریات میں سے تھا۔ ذوقؔ اس قسم کی تعلیم مکمل طور پر حاصل کر چکے تھے۔ ساتھ ہی طبیعت میں جدّت اور اختراع بحور کا شوق تھا۔ الفاظ کی قدر و قیمت سے بخوبی آگاہ اسلئے ہو گئے تھے کہ سینکڑوں دیوان نظر سے گزر چکے تھے اور اُن کا اِس کاوش سے مطالعہ کیا تھا کہ مختلف الفاظ کے محل استعمال سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔ طبیعت میں گرمی ضرور تھی مگر اُس پر اس قسم کا علم و فضل اسقدر حاوی ہو گیا تھا کہ شعریت مفقود ہو گئی تھی۔ مضامین زبان پر تھے اس لئے کہ اُس زمانے میں شعر و شاعری کے لئے خیالات رانے گنے ہوتے تھے۔ خود اپنی طرف سے مضامین اور خیالات میں جدّت نہ کر سکتے تھے اس لئے کہ پیمانے کو اصل چیز مانتے تھے نہ کہ اُس کے اندر کی شے کو۔ پابندِ قیود شاعری تھے نہ کہ شاعر اِس لئے اگر کبھی کسی خارجی واقعے کی طرف بھی اشارہ کرنا ہوتا تو اسے اتنے پردوں میں پیش کرتے تھے کہ اُس کا لطف محدود یا مفقود ہو جاتا تھا۔ اِنکی شاعری نپی تُلی چیز، قواعد سے مستحکم لیکن اثر سے دُور اور اصلیت سے بیگانہ ہوتی تھی۔ اور یہ وقت اُس زمانے کے ہر شاعر کو پیش آتی تھی کیونکہ محض خارجی انداز بیان کی تعریف و توصیف کی خاطر دل کے تاروں کو نہ چھیڑ پاتے تھے۔ اگر کوئی شاعر دانستہ یا نادانستہ کہیں

دل لگتی بات کہدیا تو صوفی کو محفل میں حال آ جاتا تھا ـــــ عموماً شعرائے کرام ماجرائے دل کو سیدھے سادے انداز میں بیان کر دینا کوئی کمال نہ سمجھتے تھے۔ تعریف تو جب ہوتی تھی کہ انھیں امورِ قلبیہ کو فنّی طور پر پیش کیا جائے ورنہ یوں رونے کو تو ہر شخص بین کر لیتا ہے اور کہنے کو ہر ایک کے منہ میں زبان ہے۔

ذوق کا زمانہ عموماً قدرتِ بیان کو سراہتا ہے نہ کہ ماجرائے بیان۔ صورتِ کلام نہ کہ موضوعِ کلام۔ اور اسی قدرتِ بیان اور صورتِ کلام کی قدر ہوئی تھی۔

مشاعرے میں یہ نہیں دیکھا جاتا تھا کہ کیا کہا ہے بلکہ کس طرح کہا ہے اور کس صورت اور شکل کو لے کر۔ دقیق سے دقیق ردیف و قافیے انمل بے جوڑ قسم کے لیتے تھے اور استاد وہی سمجھا جاتا تھا جو اُن کو نباہ دے۔ خیالات و احساسات و جذبات سے کوئی تعلق نہیں تھا گویا یہ شاعری کے لوازمات ہی میں نہ تھا۔ شاعری اُنکے نزدیک محض لفظی بازیگری تھی۔ اگر کوئی جدّت دا پیچ کی لیتا بھی تو طرزِ ادا کی پیچیدگیاں اختراع کرنے میں صرف کرتا نہ کہ خیال بندی میں۔ خیالات کو یہ طبقہ محدود سمجھتا تھا۔ اور طرزِ ادا کو لامحدود اسی لئے طرزِ ادا ہی میں ہمہ کاوشیں ہوتی تھیں۔ خیالات وہی فارسی شعرائے سے مستعار اور بندھے ٹکے ہوئے تھے اس لئے ادھر کاوش اور غور و فکر کی گنجائش نہ تھی۔ ذوق کے یہاں یہ

باتیں انتہائے کمال پر ملتی ہیں۔ یعنی یہ کہ اُن کی گرمی طبع تشکیل میں مصروف رہتی ہے نہ کہ تخلیق میں۔ جسم میں نہ کہ روح میں اور یہی اُس زمانے کا تقاضا بھی تھا۔

۳۔ ایک عالم شخص شاعر نہیں ہوا کرتا اور شاعری کے لیے علمیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ جو شعر کہہ کر کلیاں کرکے دہن و زبان صاف کر ڈالتا ہو اُس کا احترام شاعری معلوم۔ چنانچہ ہم ذوق کو صحیح معنوں میں شاعر نہیں کہہ سکتے۔ وہ محض فن شاعری یعنی شعر بنانا جانتا ہے بلکہ اپنے فن میں اسقدر استاد ہے کہ اکثر ہم کو دھوکے میں ڈال دیتا ہے، اور ڈال سکتا ہے، جیسے وہ اصلی شاعر ہو۔ اصلی شاعری ان کے یہاں ڈھونڈھے نہیں ملے گی حالانکہ فنی شاعری سے ایک مصرعہ بھی خالی نہیں۔ کمال فن کے دھوکے اکثر اُس جگہ نظر آئیں گے جہاں شعر ایسا صاف اور رواں بن گیا ہے کہ بالکل آمد معلوم ہوتا ہے۔

۴۔ فنی ارتقا ان کے کلام میں صاف ہویدا ہے۔ یعنی ابتدائی غزلیں ایسی سانچے میں ڈھلی اور ترشی ہوئی نہ ہوتی تھیں جیسی بعد کو ہوگئی تھیں۔ لیکن جو طرز انھوں نے شروع کیا تھا اس سے مرتے دم تک علیحدہ نہ ہوسکے، وہی الفاظ کی نشست کا خیال، محاوروں کو باندھنے کی کاوش، اور قوافی اور ردیف کا التزام۔ الفاظ سے الگ ہو کر معنی کی طرف آجاتے اس قسم کا

انقلاب ان کے یہاں کبھی نہیں ہو سکا۔ جوانی کا طرز رنگینیت کی طرف مائل ہے جو بعد کو پرہیزگاری کی سبب محض گرمیٔ طبع ہوکر رہ جاتا ہے۔

صرف ذوقؔ ہی ایسے شخص ہیں جو اپنے ماحول سے ہم آہنگ ہیں ورنہ اُس زمانہ کا کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جو اپنی کم نصیبی اور ناقدری کا شکوہ نہ کرتا ہو اور پھر بھلا ذوقؔ کر بھی کیا سکتے تھے۔ ایک تو طبیعت قناعت پسند۔ دوسرے حوصلہ و اُمنگ بوجہ کم حسبی کے محدود، تیسرے استاد شاہ تھے۔ اور درحقیقت اپنے عہد کے استاد مانے بھی جاتے تھے۔ محض دلّی میں نہیں بلکہ باہر بھی۔ اِس کے علاوہ خود پر اعتماد فنّی تھا۔ اس لئے بے نیازی آ گئی اور طبیعت غنی ہو گئی۔ آمدنی اور جاگیر اُن کی سی معاش و طبیعت رکھنے والے کے لئے کافی۔ یہی وجہ ہے کہ سوائے
ابتدائی ایک دو غزلوں کے کہ جب تک یہ بادشاہ کے نوکر نہیں ۵
ہوئے تھے اُن کے کلام میں کہیں اپنے زمانے سے کوئی شکایت معلوم نہیں ہوتی۔ اور بہادر شاہ شاہِ شطرنج ہو لیکن ان کے لئے سلطان سنجر سے کم نہ تھا اگر کبھی شکایت کی قسم کا کوئی جذبہ
پیدا بھی ہوتا تو اس پر قناعت غالب آ جاتی اور دلّی کی گلیاں ۶
زنجیر پا بن جاتیں۔

اس کے علاوہ طبیعت پرہیزگاری اور تصوف کی طرف

مائل۔ وظیفہ و وظائف میں مشغول رہنے والے، دنیا بھر کی بہتری
کے لئے دعا مانگنے والے منکسر المزاج، قانع اور حلیم الطبع۔ ایسا
شخص ناصح بہتر ہو سکتا ہے بہ نسبت شاعر کے۔ شاعر کے لئے
ہمیشہ ایک بے چین روح کی ضرورت ہے وہ ذوق کے یہاں
مفقود تھی۔ ان کی جوانی کے ولولے بھی شاعری کے معرکوں
میں صرف ہوئے نہ کہ وارداتِ شاعری میں۔ شب ہجر کے
مضمون بنانے میں، نہ کہ شبِ ہجر کے تارے گننے میں۔ ان کی
جوانی کی غزلیں دیکھیے۔ الفاظ رنگین اور شگفتہ ہیں لیکن مضمون
رنگین نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس پرہیزگار شاعر کا دیوان
کا دیوان الٹ جائیے کہیں معاملہ بندی میں بھی ایسا شعر نہ نکلے
شہ گا جسے محض الفاظ و محاورہ ہی کی خاطر عریاں کہا جا سکے۔ اپنے
عہد میں ذوق اس خصوصیت کے تنہا علمبردار ہیں۔ ورنہ اور
سب کبھی نہ کبھی ضرور بہک جاتے ہیں۔ کچھ زمانہ کا مذاق اور
کچھ اُن کا اپنا طریقہ کہ اربابِ نشاط کے لئے بھی غزلیں لکھتے
ہیں تو مضمون بندی کی نہ کہ ایسی جو گرما دیں اور تڑپا دیں۔
معاملہ بندی اگر کسی جگہ ہے بھی تو سراسر آورد۔

شہ ذوق کو الفاظ سے اور نشست الفاظ سے بیحد شوق
تھا کچھ تو یہ کثرت مطالعہ کا سبب تھا کچھ یہ کہ ان کا زور طبع یا
زور جذبات چونکہ خیالات کی طرف جاتا نہیں تھا، لا محالہ

فراوانی الفاظ کی طرف منتقل ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے
جوانی میں نئی نئی اور طویل بحروں میں اپنا زور طبع دکھایا بلکہ
وہ لمبی بحروں میں کہنے کا شوق اخیر تک باقی رہا۔ ابتدا کے قصائد
میں بھی فراوانی الفاظ کا خاص مظاہرہ اور اہتمام ہے۔ ایک وجہ
یہ بھی تھی کہ مشاعروں میں لمبی بحروں والی غزلیں پڑھ کر اور
الفاظ و نشست کی شان دکھا کر اپنا سکہ جمانا چاہتے تھے اور
جما لیتے تھے بلکہ ایک خیال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قصیدے میں
سوداؔ کا تتبع کرنے سے غزل میں بھی لفظی درد بست اور سلیقے میں
مدد ملی ہو۔ لیکن دراصل لمبی بحروں، سنگلاخ زمینوں اور مشکل
ردیف و قافیوں میں کہنے کی عادت انھوں نے شاہ نصیر کی
میراث و مقابلے میں پائی تھی۔ اس کے علاوہ خواص اور عالی مرتبہ
شعراء کی پہچان اور طغرائے امتیاز بھی دقت پسندی اور مشکل
گوئی تھی نہ کہ خیالات کی بلند پروازی جیسی کہ آجکل ہے اس لئے
قدرت کلام اور قوت بیان کی آزمائش اور پہچان اسی وقت
ہوتی اور ہو سکتی تھی جب اَن مل بے جوڑ باتیں ملادی جائیں۔
عوام اس سے عاری تھے اس لئے وہی شعراء لائق ستائش و
منزلت سمجھے جاتے جو اس ہفت خواں سے بآسانی عہدہ برآ
ہو سکتے تھے۔ حالانکہ ذوقؔ کے زمانے میں مصحفیؔ و انشاؔ نہ رہے
تھے پھر بھی ناسخؔ کی غزلیں لکھنؤ سے برابر آیا کرتی تھیں اور

اُن پر غزلیں نہ کہنا ذوق اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے۔ غرضکہ قافیہ پیمائیوں
کا بُرا ہو کہ اُن کا تمام دیوان اسی قسم کا ایک دفترِ بے معنی بن کر
۱۱ رہ گیا ہے گویا ایک لحیم شحیم جسم ہے جس میں جان نہیں۔

رعایت لفظی ذوق کے آرٹ کا خاص جزو ہے۔ کہیں
۱۲ کسی غزل کسی شعر میں اس سے چھٹکارا نہیں۔ اور ذوق کیا یہ بھی
اُس زمانے کی روایات میں سے ہے اور جس کو خصوصاً نصیر اور
ناسخ نے بہت سراہا اور رواج دیا اور جو اتنا مرغوب زمانہ رہا
کہ نہ صرف اُسی زمانہ میں اُس کی گرما گرمی رہی (یہانتک کہ
مومن نے بھی بیشتر اور غالب نے کبھی کبھی اس کو اختیار کیا)
بلکہ بیسویں صدی کے ربع اول تک اس کا قبول عام قائم رہا۔
ذوق کی صناعی کی بنیاد بہت کچھ اسی پر قائم ہے۔

۱۳ دوسری چیز محاورہ کا استعمال ہے عموماً محاوروں کا
استعمال اِس وجہ سے کیا جاتا تھا کہ شعر عوام کی زبان پر رواں
ہو سکیں جس کی وجہ سے شہرت ہو۔ دوسرے اُس میں خوبصورتی
اور روانی پیدا ہو جائے۔ تیسرے اس لئے کہ محاورے خود محفوظ
ہو جاویں۔ ان کا محل استعمال واضح ہو جائے۔ اور اس طرح زبان
کی خدمت ہو سکے۔ اکثر یہ وجہ بھی ہوتی تھی کہ عام طور پر محاوروں
کا استعمال اور موزوں کر دینا بوجہ اُن کی نثریت کے مشکل اور
دقت آمیز ہوتا ہے اس لئے بیان پر قدرت رکھنے والے شاعروں

کے جذبۂ تفاخر کو ایک خاص قسم کا سکون حاصل ہوتا جب وہ ایسی ٹھیٹھ نثر کو خوبصورت نظم کی شکل میں پیش کر سکتے ۔ چنانچہ ذوق اور داغ اس امر میں خاص طور پر معروف ہیں ان کے شاگرد محاوروں کی فہرستیں ان کو پیش کرتے تاکہ ان کو یہ ماہرین فن شعر میں منتقل کر دیں۔ اور اس طرح وہ محاورے محفوظ ہو جائیں اور ان کے نام و کلام کے ساتھ ہمیشہ قائم رہیں۔ ذوق کے یہاں جذبات عموماً نہیں ملتے لیکن اکثر وہ یہ کرتے ہیں کہ کسی عام تجربے کو ذہن میں رکھ کر مناسب محاورہ پیش کر دیتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ محاورہ کا استعمال کلام کو بقائے دوام دینے کا ایک بڑا ذریعہ ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس طرح شعر میں نبھائے جائیں کہ یہ نہ معلوم ہو کہ شعر انھیں کی خاطر کہا گیا ہے اور وہ محض اوپر سے جما دیے گئے ہیں۔ ذوق کو محاورے استعمال کرنے کا شوق ابتدا سے مرتے دم تک قائم رہا۔[۱۴]

کچھ تو طبعی مناسبت کی بنا پر اور کچھ اسی محاورہ بندی کے شوق کی طرح کہاوت اور مثلوں اور تجربے کی باتوں کو نظم کرنے کی خواہش بھی ذوق کے یہاں پائی جاتی ہے وہ اکثر اپنے تجربوں کو یا دنیا کے تجربوں کو، یا چند سیدھی سادی زندگی کی نصیحتوں اور حقیقتوں کو نظم کر دیتے ہیں اس طرح اور ایسے موزوں سادہ الفاظ میں کہ لوگوں کی زبانوں پر رواں ہو سکیں اور ایک کہاوت کی طرح مناسب موقعوں پر مستعمل ہو سکیں۔ لیکن دراصل اس قسم کی ناصحانہ اور بزرگانہ باتوں کو شاعری نہیں کہہ سکتے جب تک ان میں کوئی شعری لطافت نہ ہو۔

محض چند سیدھی سادھی زندگی کی حقیقتوں کو نظم کر دیتا ہے۔ یہ ضرور ہوا کہ بہت سی یہ باتیں اس طرح مثلوں کی طرح زبان زد عام ہو گئی ہیں۔[۱۵]

حسن تعلیل اور ایک مصرعے میں ایک بات کہہ کر یا مسلہ بنا کر دوسرے مصرعے میں اس کا ثبوت یا شہادت پیش کرنا یہ ایک طرز خاص تھا کہ متاخرین خصوصاً صائب کے مطالعہ سے اُس زمانہ میں پیدا ہوا تھا اور تمام اردو شاعری (کیا دلی اور کیا لکھنؤ) میں رائج ہو گیا تھا جب شاعر دوسرا مصرعہ پڑھتا تھا تو وہی لطف آتا تھا جو کہ ایک مسئلہ کے حل کرنے میں آتا ہے۔ تخئیل کو آزادی تھی کہ جس قسم کے مسلے یا مسلے بنا کر پیش کرے، قدردانی یوں ہوتی کہ واہ فلاں بات کا کیا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ غرضیکہ یہ طرز عام تھا اور مقبول تھا۔ ذوق نے بھی اس کو برتا اور بہت کافی بہتات کے ساتھ اس سلسلہ میں ان کا ایک شعر بہت مشہور ہے ؎

خط بڑھا زلفیں بڑھیں کاکل بڑھے گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

حسن تعلیل کی خوبی اور خوبصورتی اسی میں ہے کہ ثبوت یا شاعرانہ توجیہہ اس قدر لطیف ہو کہ واقعیت ٹپکے اور بالکل صحیح معلوم ہو لیکن اگر تخئیل کی آزادی کی وجہ سے ایسا مسلہ یا ثبوت پیش کیا جاوے جو اصلیت سے بہت ہی زیادہ دور ہو جائے تو وہ باوجود شاعرانہ ہونے کے پسند نہیں کیا جاتا۔ بیسویں صدی سے شعراء اس طرز کی طرف زیادہ مائل نہیں ہیں اس لیئے کہ ان کی قوت تخئیل دوسرے میدانوں یعنے اصلیت اور حقیقت کی طرف رواں ہو گئی ہے۔[۱۶]

بہت کچھ اسی طرح کی مقبول چیز رعایت لفظی تھی ۔ قادر الکلامی کے اس عہد میں معنی یہ تھے کہ الفاظ کے استعمال پر اتنی قدرت ہو کہ شاعر ایک لفظ کی رعایت سے دوسرا لفظ لا سکے ۔ ہر شاعر اس صنعت سے کافی متاثر تھا اور اس کی تمام تر کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ اس لفظی تلازمے کو بڑے ہنر کے ساتھ پیش کر سکے ۔ ذوق کا بیشتر کلام اس صنعت پر موقوف ہے اور اپنے عہد کے دیگر شاعروں کے مقابلہ میں سب سے بہتر طریقے پر لیکن اگر یہ صنعت بغیر کسی خیال کے ہو تو محض لفظی گورکھ دھندا ہو کر رہ جاتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ذوق کے اس قسم کے اشعار اب زیب طاق نسیاں ہوتے جا رہے ہیں ۔ بہ مقابلہ مومن و غالب کے کہ اُن کے یہاں یہی چیزیں بوجہ خیال کے زیادہ اجاگر ہیں ۔ رعایت لفظی چونکہ لفظی صنعت گری کا بہت بڑا جزو ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اکثر موقعوں پر شعر کو خوبصورت بنا دیتا ہے شعراء اب بھی اس سے تزئین کلام میں مدد لیتے ہیں ۔ لیکن یہ چیز اب مقصود بالذات نہیں رہی یعنی اس کی خاطر اب خیال کا خون نہیں کیا جاتا ۔

محاورہ

روزمرہ کا استعمال اسی طرح ان شعرائے متقدمین کے فن کا خاص جزو تھا ۔ اور اس میں شک نہیں کہ شعر کی ظاہری خوبی روزمرہ کے ظاہری استعمال سے بہ نہایت درجہ بڑھ جاتی ہے روانی الگ آ جاتی ہے اس سے شعر عام پسند بھی ہو جاتا ہے ، ذوق روزمرہ استعمال کرنے کے بادشاہ ہیں کسی شعر کو بغیر اس طرح خوبصورت بنائے نہ چھوڑیں گے ۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اکثر وبیشتر مقصد محض روزمرہ کا استعمال ہی ہوتا ہے اس لیے خیال کی پرواہ نہیں کرتے لیکن

اگر کبھی خیال اس طرح کے خوبصورت سانچے میں آ کر ڈھل جاتا ہے تو شعر اچھا اور بامزہ ہو جاتا ہے۔

۱۹

ذوق کے یہاں تشبیہ اور استعارے عموماً بے مزہ، غیر فطری اور بیکار ہوتے ہیں اگر کبھی کوئی اچھا نکل آیا تو اسے اتفاق سمجھنا چاہئیے وجہ اس کی یہی ہے کہ وہ اول تو رعایت لفظی سے تشبیہ یا استعارہ بنانا چاہتے ہیں یا حسن تعلیل سے ثابت کرنا یا کسی لفظی صنعت سے حاصل کرنا (شاہ نصیر کی طرح) ظاہر ہے جب مقصود بالذات ضائع لفظی ہوں گے تو تشبیہ و استعارے کی خوبی معلوم لیکن پھر بھی وہ اس قسم کی تشبیہ و استعاروں سے پرہیز کرتے تھے مثلاً ؎

ہے کاٹنے کو دوڑتا کتا تفنگ کا

یا

مینڈھا حلال کرتے ہیں دریائے نیل کا

جس سے کلام بالکل ہی بدمزہ ہو جاتا ہے۔

پرانے متروک الفاظ کا استعمال ذوق کے یہاں بہت کم ہے صرف ان کے ابتدائی اور جوانی کے اشعار میں کچھ ایسے الفاظ ضرور پائے جاتے ہیں، بول چال میں اپنے بچپن میں انھیں سنتے تھے وہی باندھ دیتے تھے۔ مگر آخر کے کلام میں "ٹک" "یارو" "جان من" کے الفاظ چھوڑ دئیے بقیہ تقریباً تمام تر کلام کی زبان موجودہ کہی جا سکتی ہے اور سوائے بل بے، آئے ہے، جائے ہے، آدے جادے، پر، "کہونگے" کیونکہ بمعنی کیونکر۔ چٹ بمعنی جلدی وغیرہ معدودے

چند الفاظ کے اور کوئی لفظ ہمارے گوش پر گراں نہیں گزرتا جلنے کی ترکیبیں ایسی ہیں جو ابھی تک رائج ہیں اور "آئے ہے" "جائے ہے" کی ترکیب تو باوجود متروک ہو جانے کے نظم میں اب تک بھلی معلوم ہوتی ہے۔

طنز

ذوق اکثر مسکراتے ہوئے بھی پائے جاتے ہیں لیکن بیشتر روایتی واعظ اور ناصح پر اُن کی ظرافت گہری یا پُر معنی یا طنزیہ نہیں، محض تفریحی ہوتی ہے کبھی ضلع جگت یا رعایت لفظی سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ذوق نہ لاابالی، بے فکر بذلہ سنج مصاحب تھے، نہ زندگی اور اس کے علائق پر سوچکر ہنسنے والے مفکر لیکن طبیعت میں شگفتگی تھی اور قلم میں جوش، اس لیے اکثر شعروں میں خندۂ زیر لبی کا احساس موجود ہے۔

عام طرز ذوق کی شاعری کا ایک طرح کی گرمی ہے چستی ترکیب، خوبی محاورہ اور عام فہمی، لیکن اُن کی گرمئ کلام چستی ترکیب، خوبی محاورہ اور عام فہمی ادنیٰ درجہ کی نہ تھی بلکہ ایسی کہ جس الفاظ یا محاورے کو باندھ دیتے تھے بڑے بڑے شاعر عاجز ہو جاتے اور اب بھی کسی شاعر کے لیے آسان نہ ہو گا کہ ان کے مقابلے میں ان الفاظ یا اُن تراکیب کو اُن سے بہتر باندھے جو انھوں نے باندھی ہیں۔ ان کی شاعری کا رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا ابتدا میں شاہ نصیر اور مرزا رفیع کا ڈھنگ رہا۔ معروف کے شعر بنانے میں ولی اور درد کا کچھ رنگ آیا، ظفر کی استادی میں جرأت، انشا و مصحفی کا طریقہ اختیار کیا لیکن ان کی غزل کا عام رنگ نصیر و ناسخ کا ہے یعنی لکھنوی

نہ کہ دہلوی۔ عام پہچان ذوق کی غزل کی یہ ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی محاورہ کہاوت یا روزانہ کا تجربہ ضرور باندھتے ہیں۔

ذوق کی شاعری آجکل پسند نہیں کی جاتی، اس لیے کہ انھوں نے صرف لفظی یا خارجی شاعری کی۔ نہ درد کی طرح صوفیانہ، نہ غالب کی طرح حکیمانہ، نہ میر کی طرح عاشقانہ، یعنی یہ کہ جذبہ ان کے یہاں سرے سے مفقود ہے۔ مگر اس امر میں وہ اپنے ماحول سے مجبور تھے۔ مذاق شعری اور نظریۂ شاعری اُس زمانہ میں یہی تھا کہ الفاظ اور محاوروں کے استعمال پر غیر معمولی قدرت حاصل ہو مضمون اور خیال کو محدود اور بندش الفاظ کو لامحدود سمجھا جائے۔ اور اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ذوق کو یہ قدرت تام و کمال حاصل تھی اور اسی بنا پر جو وہ ملک الشعراء بنائے گئے تو ان کا انتخاب حق بجانب تھا۔ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کیا ذوق کی شاعری بیکار محض ہے؟ یہ صحیح ہے کہ وہ طبعاً شاعر نہیں تھے محض زبان کے ماہر تھے نہ ان کے یہاں روحانی واردات کے نقشے ملتے ہیں نہ قلبی کیفیات نہ فطرت انسانی کا مطالعہ۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ان کو آجکل کے معیار سے جانچا جائے تو شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ان کی زبان کی خدمات سے کسی طرح پر انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو جو اُس زمانہ میں بہت وقعت کی نظر سے نہ دیکھی جاتی تھی اور کم عمر ہونے کی وجہ سے ناپختہ اور غیر مربوط تھی۔ ان کی شاعری کی بدولت مستند مستحکم اور پختہ ہو گئی۔ ہر زبان کی تشکیل میں اس قسم کے مجاہد پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ذوق کی شاعری کو کسی طور پر بیکار نہیں کہا جا سکتا۔ وہ بحیثیت شاعر کے نہ مانے جائیں نہ سہی لیکن اگر انھیں محض قواعد داں ہی سمجھ لیا جاوے

جس نے زبان کو محفوظ اور مربوط بنانے کے لیے اپنے قواعد اپنے محاورے اپنی صنعتیں منظوم کردی ہیں تب بھی ذوق کی خدمت زبان بہت سے شاعروں کی خدمت ادب پر فوقیت لے جائے گی ان کے کلام سے زبان کے ارتقاء کی اچھی خاصی تاریخ بنائی جا سکتی ہے اور اس لیے کسی ماہر لسانیات کے لیے ان کا دیوان نادر تحفہ کہا جا سکتا ہے۔ ہندی اور فارسی کا امتزاج جو عرصے سے کشمکش میں تھا ذوق کے کلام میں پختہ ہو کر اردو ہو گیا ہے اور یہی اردو آگے چلکر داغ کے یہاں ایک پیکر جمیل بن گئی ہے۔

۲۱

کیا ذوق شاعر ہو سکتے تھے؟ اس میں شک نہیں بعض اشعار ان کے دیوان میں خیالات اور جذبات کے اعتبار سے بہت اچھے ملتے ہیں اور جن کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ شاعر ہو سکتے تھے لیکن شاہ نصیر کی شاگردی اور ان کے مقابلے نیز دیوان ناسخ کے اثر، اپنی گوشہ نشینی اور بادشاہ اور معروف کی اصلاح و فرمائشات نے انھیں صرف منشی بے بدل بنا کر رکھ دیا۔ لیکن ان چند اچھے اشعار کی بناء پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اچھے شاعر ہوتے اس لیے کہ اتنا تو سوزوگداز ہر بشر کے دل میں پایا جاتا ہے اچھے شاعر کی روح کو سرتاپا گداز ہونا چاہیے اس لیے ان کے اچھے اشعار کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ مستثنیات ہیں ان کے اپنے اصلی رنگ سے الگ اور محض اتفاقات جو بیشتر کثرت و مشق و کمال استادی سے یوں رواں خوبصورت اور ایسے عمدہ نکل آئے ہیں گویا سچ مچ ان کے دل سے نکلے ہیں۔

قصائد

ذوق کا نام در اصل اُن کے قصائد کی وجہ سے زندہ ہے اور رہے گا۔ اس لیے کہ متوسطین شعرا میں سوائے ان کے اور کوئی ممتاز قصیدہ گو نظر نہیں آتا۔ اور اس لیے بھی کہ ظفر شاہ کے دربار کے بگڑنے اور انگریزوں کے ساتھ واقعیت کی آمد نے گویا اس صنف ہی کو اڑا دیا لیکن ان کے قصائد کی تاریخی حیثیت ادب میں ہمیشہ اہم اور مسلم رہے گی۔

ذوق نے اپنے قصائد کی داغ بیل سودا کے قصائد پر ڈالی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ خود مختلف علوم میں دست گاہ رکھتے تھے اور اس کے ساتھ ہی زبان پر قدرت لیکن سودا کی سی اپج اور آمد نہ تھی۔ سودا اساتذہ فارسی کے قصائد کا مطالعہ کر چکے تھے اُن کے قصیدوں پر قصیدے لکھ چکے تھے۔ اس لیے اب ذوق کو دوبارہ اساتذۂ فارسی کی تقلید کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے علاوہ اردو میں اُس وقت تک دوسرے شعرا اس قدر اس صنف میں مشہور و معروف بھی نہ ہوئے تھے۔ دلی کے کوچہ و بازار سودا کے قصائد کی تعریف سے گونج رہے تھے۔ اسی لیے ذوق نے جو کچھ سیکھا زیادہ تر سودا کے تتبع سے سیکھا۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ذوق سودا کے اس معنی میں شاگرد ہیں۔

حالانکہ سودا کا اشہب تخیل ذوق کے سمند تصور سے کہیں زیادہ بادپا ہے وہ جتنی بلندیوں پر جاتے ہیں۔ جتنی موشگافی، جوش، زور اور نزاکت تخیل دکھاتے ہیں وہ ذوق سے بن نہیں پڑتی۔ کوشش کرتے ہیں اور بہت حد تک کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن پھر بھی وہ چھلاوہ پن، وہ تیزی، طراری اور جولانی جو سودا کے یہاں ہے ذوق کو میسر نہیں آتی۔ ذوق کے یہاں سودا کی سی اُپج کبھی نہیں ملتی

برخلاف اس کے ترصیعی کام زیادہ ملتا ہے۔ سودا جگہ جگہ پر اجتہاد کے لیے بے چین نظر آتے ہیں، ذوق، صنائع والفاظ کے پھیر میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ ذوق گلکاری زیادہ اچھی کریں گے لیکن سودا کی سی مصوری نہیں کر سکتے اور غالباً یہ دونوں کے طبائع کا اثر ہے کہ ایک رند مشرب شخص ہے اور ایک عابد و زاہد۔ ظاہر ہے کہ رند کی دنیا کس قدر وسیع ہوتی ہے اور اور زاہد کی کس قدر محدود۔ اور یہ طبائع کا اثر ہر دو کے قصائد میں نمایاں طور پر جھلکتا نظر آتا ہے۔ سودا کے یہاں جوش، جذبہ اور روانی ہے۔ ذوق کے یہاں متانت، جزالت اور گرمی۔ تخیل کا میدان سودا کا ہے لیکن مشق اور استادی نے ذوق کو کافی اونچے درجہ پر پہنچا دیا ہے اس کے علاوہ ذوق کے زمانہ میں چونکہ زبان بھی متروک الفاظ سے بہت پاک ہو گئی تھی اس لیے بالکل موجودہ اردو معلوم ہوتی ہے ان کے قصائد میں فارسیت زیادہ ہے بہ نسبت بھاشا پن کے جو سودا کے زمانہ کی پہچان ہے نیچرل سادگی بھی ذوق کے قصائد میں سودا کی سی نہیں۔ وجہ یہی کہ ان کی دنیا محدود تھی۔ ایک تنگ و تاریک مکان کی رہائش، کم آمیز، خارجی مناظر فطرت کی صناعیاں کیسے بیان کرتے۔ اگر کبھی بیان بھی کرتے ہیں تو کتابی تشبیہوں اور استعاروں کے پردے میں مجموعی طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ سودا میں فطانت تھی اور ذوق میں کتابی قابلیت۔

طبعاً ذوق کو قصائد سے بہ نسبت غزل کے زیادہ مناسبت تھی۔ اس لیے کہ علوم متداولہ سے واقف، الفاظ اور ان کی نشست سے بخوبی آگاہ، سنگلاخ

زمینوں اور مشکل ردیفوں اور قافیوں پر عبور، صنائع و بدائع و دیگر رعایات لفظی کے ماہر، مشق سخن نہایت بڑھی ہوئی اور یہی تمام چیزیں قصیدے کے دروبست میں نہایت مفید ثابت ہوتی ہیں۔ ناممکن تھا کہ ذوق قصیدہ کہتے اور وہ مقبول نہ ہوتا۔ ظفر حالانکہ بے بس بادشاہ تھا پھر بھی ذوق کے لیے بہت کچھ تھا۔

ذوق تقلید اچھی کرسکتے تھے انھوں نے اپنی طرف سے کوئی خاص جدت قصیدے میں نہیں کی۔ اکثر و بیشتر سودا کے قصائد کے مضامین کا چربہ اتارتے رہے لیکن الفاظ کی شان و شوکت، چمک دمک سے وہ آب و تاب پیدا کر دیتے تھے جس سے قصیدے میں ایک عجیب شان پیدا ہو جاتی تھی۔ علمیت کی وجہ سے بھی ان کی تشبیب سودا سے اکثر ارفع اور جزیل ہو جاتی ہے۔ حالانکہ ان کے بیشتر قصائد ایسے ہیں جن پر وہ نظر ثانی نہیں کر سکے۔ پھر بھی وہ اردو ادب کے خزانے ہیں۔ خصوصاً مرصع تشبیبوں میں ذوق کی قدرت الفاظ دیکھکر حیرت ہوتی ہے تشبیب دراصل ممدوح کو متوجہ کرنے کا ایک ذریعہ ہوا کرتی تھی جو مختصر جامع اور مناسب باتوں پر مشتمل ہوتی تھی لیکن ذوق کے زمانے تک وہ شاعر کے ہنر و فن کی نمائش کا ایک موقعہ بن گئی تھی اسی لیے ذوق کی تشبیب عموماً طویل ہوتی ہے خصوصاً ان قصائد میں جو انھوں نے کاوش اور دلچسپی سے لکھے ہیں

گریز کے مقام پر شاعر کو اپنی نزاکت تخیل دکھانے کا موقع ہاتھ آتا ہے اور عموماً شعرا اسے خوبصورت بنانے کے لیے طرح طرح کی شاعرانہ نزاکتوں کو باندھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی ذوق نے کوئی نرالی ترکیب نہیں نکالی۔

بیشتر وہی پرانے طریقے برقرار رکھے ہیں۔ ان کے یہاں گریز، اسی لیے عموماً سیدھے سادے طور پر شروع ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اہتمام بہت ہوتا ہے۔ لیکن وہ گریز واقع ہونے سے پہلے ہی قیاس معلوم کر لیتا ہے کہ گریز کس موقع پر اور کس طرح کی ہوگی۔ اس لیے جب وہ واقع ہوتی ہے تو اس میں کوئی ندرت نہیں محسوس ہوتی یعنی تشبیب اور مدح کو جوڑنے کے لیے گریز کا جوڑ ایسا دفعتاً یا دلفریب نہیں ہوتا جو دل پر کھٹکے اور بے اختیار تحسین پر مجبور کر دے۔

مدح میں بھی وہی پرانا طریقہ باقی رکھا ہے یعنی کبھی بادشاہ کی شجاعت و دلیری کی، کبھی اس کے عدل و انصاف کی، کبھی اس کی عقل کی، اور کبھی صورت و شکل کی تعریف کی ہے۔ دشمنوں اور حاسدوں کی برائی، بادشاہ کی تلوار، ہاتھی اور گھوڑے کی تعریف میں بھی مقررہ اور معروف طریقے برتتے ہیں یعنی تعریف میں اس قدر غلو کہ عقل و تمیز تو درکنار تصور و خیال بھی متحیر ہو جائے کہ کس طرح ناممکن باتیں ممکن بنا دی گئی ہیں۔

ذوق کی دعاؤں میں بھی کوئی خاص امتیاز نہیں، سوائے اس کے کہ مناسب ہیں اور مقررہ قواعد و گزشتہ روایتوں کے بالکل مطابق سوائے ایک قصیدے کے جو سراسر دعائیہ ہے اور جو ذوق کے عام طرز میں ایک نئی بات ہے۔

زیادہ تر قصائد بہادر شاہ کی تعریف میں ہیں اس لیے کہ اُن کے استاد اور ملازم تھے اور ملازمت کی وجہ سے ہر اس موقعہ کے متلاشی رہتے تھے جس پر قصیدہ پیش کیا جا سکتا تھا۔ غسل صحت کا موقع ہو یا عید کی خوشی نوروز ہو یا کسی کی شادی۔

اس زمانہ میں ایک طغرائے امتیاز یہ بھی تھا کہ مشکل ردیف و قافیہ میں قصیدہ لکھا جائے۔ ایسی دردسری" اس میں شک نہیں کہ قصیدہ کی شان کو اکثر بڑھا دیتی ہے کیونکہ مشکل ردیف و قوافی کی وجہ سے غیر مانوس اور ادق الفاظ کا استعمال کرنا پڑتا ہے اور اسی سے قصیدہ میں ایک طرح کی جزالت آجاتی ہے حالانکہ قصیدے کے لیے نامانوس اور ادق لغات ضروری نہیں پھر بھی اگر روانی اور تناسب سے لائے گئے ہوں تو قصیدے کی شان کو ضرور بڑھا دیتے ہیں۔

ذوق کے قصائد کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ ان کی زبان پختہ اردو ہے یعنی وہ زبان جو ولی نے شروع کی تھی اور میر و میرزا نے پروان چڑھائی، ذوق کے یہاں پہونچکر خوب منجھ کر صاف ہو گئی ہے۔ ایرانی قالینوں میں اب ٹاٹ کے پیوند نہیں ہیں۔ فارسیت ضرور زیادہ ہو گئی ہے مگر قصیدے میں اگر غور کیا جاوے تو بغیر شان و شوکت کے گزارہ نہیں، اور شان و شوکت کے لیے بغیر عربی و فارسی الفاظ کے چارہ نہیں۔

سلیقے سے نگینہ کی طرح جڑے ہوئے الفاظ، شان و شوکت سے بھرپور صنائع لفظی و معنوی سے مستحکم، علمیت کے زور سے بھاری اور جزیل، یہ تمام باتیں اگر دیکھنا ہوں تو ذوق کے قصائد کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہاں سادگی اور سلاست کا مذکور نہیں، یہاں بذلہ سنجی، ہجو یا ظرافت کا گزر نہیں، جو چیز ملے گی وہ عالمانہ، جو کچھ نظر آئے گا وہ فاضلانہ شوخ و شنگ شعریت کا یہاں ٹھکانا نہیں ہر شے متشرع ہے، متین اور سنجیدہ تشبیہہ و استعارے بھی قواعد کے لحاظ سے

پختہ نظر آئیں گے لیکن بیشتر ایسے پھول ہوں گے جن میں بو باس نہیں، اور یہی وجہ ہے ان کے قصائد کی زیادہ تقلید نہ ہو سکی۔ یوں تو زمانہ بھی بدل گیا تھا اور بدل رہا ہے۔ پھر بھی ذوق کے بعد جن شعراء نے قصائد کہے وہ اس پایے کے نہ تھے اول تو ان شعراء کو نہ تو الفاظ پر اتنی قدرت تھی، نہ خود میں اتنی جامعیت، دوسرے یہ کہ غدر کے بعد جو دو ایک نواب رہ گئے تھے وہ زیادہ فیاضی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ان کے دربار میں قصیدوں کے بجائے غزلوں کا زیادہ زور رہا۔

ہمعصر ہونے کی وجہ سے غالب کے قصائد کا بھی خیال آتا ہے۔ حالانکہ ذوق کے سامنے غالب کے قصیدے پوچھے نہ جاتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب کے تھوڑے سے قصیدے اپنی بے ساختگی، روانی اور معنویت کے لحاظ سے ذوق کے قصیدوں سے یقیناً بلند ہیں البتہ لفظی نشست ظاہری دروبست اور ترصیعی اعتبار سے ذوق کے بہتر ہیں۔ لیکن غالب کے قصیدے میں جو روانی اور تسلسل ہے اسے پرشکوہ الفاظ کی ضرورت نہیں ہے اگر ذوق کے قصائد پڑھنے سے سامعہ پر جوش، زور اور شکوہ کا احساس ہوتا ہے، تو غالب کے قصائد سامعہ کو مدہوش کر کے اپنی ترتیل و ترنم میں بہائے جانا چاہتے ہیں۔ قصائد چونکہ سنانے کی چیز ہوتی تھی اس لیے سماعت پر اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

قصیدوں میں شاندار الفاظ کی روایت دراصل بادشاہوں کے جنگی کارناموں کی مدح سرائی کی بدولت پیدا ہوئی بعد میں یہ ہو گیا کہ جو شاندار الفاظ

کو مرتب و منظوم کر دے وہ قصیدہ گو ہو سکتا تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے لیے بھی شاعرانہ دل و دماغ کی ضرورت ہے اور اس میں وہی کامیاب ہو سکتے ہیں جنھیں فطری اپج کے ساتھ الفاظ کو سلیقے سے بٹھانے کا ڈھنگ معلوم ہو۔ اردو میں فارسی کی طرح زیادہ قصیدہ گو پیدا نہیں ہو سکے۔ کیونکہ اردو خود شہنشاہیت کے آخری دور میں پیدا ہوئی۔ جمہوریت میں اس قسم کے موقعے جن میں شاعروں کو کثیر منافع کی امید ہو، شاذ پیدا ہوں گے۔ اب اگر کسی کی شان میں قصیدے لکھے بھی گئے تو وہ واقعیت سے زیادہ نزدیک ہوں گے۔ دوسرے الفاظ میں کلاسیکل قسم کے قصیدوں کا زمانہ ختم ہو گیا لیکن ذوق کے قصائد کی تاریخی حیثیت اردو ادب میں ہمیشہ مسلّم رہے گی۔

{ ذوق کے کلام کے متعلق جو باتیں اس مضمون میں پیش کی گئی ہیں اُن کے حوالے ترتیب سے درج ذیل ہیں۔ }

۱ے

فرماتے تھے کہ میں نے ساڑھے سات سَو دیوان اساتذہ سلف کے دیکھے اور اُن کا خلاصہ کیا۔ خان آرزو کی تصنیفات، ٹیک چند بہار کی تحقیقات، اور اس قسم کی اور کتابیں گویا اُن کی زبان پر تھیں ... شعرائے عجم کے ہزاروں شعر انھیں از بر تھے اور گفتگو کے وقت نہایت تڑاق سے سند پیش کرتے تھے۔ مجھے اس کا تعجب نہیں کیونکہ جس فن کو وہ لیے بیٹھے تھے یہ سب اس کے لوازمات ہیں ہاں تعجب ہے کہ تاریخ کا ذکر آئے تو وہ ایک صاحب نظر مورخ تھے۔ تفسیر کا ذکر آتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ شیخ شبلی ہیں یا بایزید بسطامی

بول رہے ہیں۔ وحدت الوجود اور وحدت شہود میں علم اشراق کا پرتو دے کر کبھی ابوسعید ابوالخیر تھے کبھی محی الدین عربی۔ پھر جو کہتے ایسی کانٹے کی تول کہتے تھے کہ دل پر نقش ہو جاتا تھا۔" اس کے علاوہ رمل، نجوم، طب، اور موسیقی کے واقعات کے لیے دیکھئے۔ مقدمہ دیوان ذوق مرتبہ آزاد)

؎۲

ملاحظہ ہو۔ وہ غزل جو دریٔ وطن پر نثار علی شاہ کو سنائی یا وہ غزلیں جو بارہ ٹوپی والے معرکے پر لکھی یا جو فضل حق خیر آبادی کو سنائی۔ (ص ۷۹، ۱۳۰، ۱۴۱) دیوان ذوق مرتبہ آزاد، مطبوعہ محبوب المطابع دہلی ۱۹۳۲ء)

؎۳

پاک رکھ اپنا دہاں ذکر خدائے پاک سے　　کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے

؎۴ آخری غزل

کیا کہیں اس سے جو ہو ہم سے زیادہ جانتا　　وہ ارادہ ہے ہمارا بے ارادہ جانتا
بولتا بڑھ بڑھ کے اتنا کیوں بشر مست غرور　　گر ذرا بول اپنا قاضی کا پیادہ جانتا
کرتا ہے جب نالہ اپنا عالم بالا کی سیر　　ہے فلک پر کہکشاں کو خط جادہ جانتا
آفتاب حسن کو کیا خاکساروں کا ہو درد　　پا فتادہ کا ہے درد از پا فتادہ جانتا

؎۵ ابتدائی غزلوں میں یہ دو شعر ملتے ہیں

دُرِ مضموں ہیں ترے ذوق زبس بیش بہا　　کم کوئی ان کا خریدار نظر آتا ہے
قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ　　سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

۷۶

گرچہ ہے ملک دکن میں اِن دنوں سخنوں کی قدر　　کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

۷۷

سوائے ایک آدھ مثالوں کے، وہ بھی محض رعایت لفظی کی خاطر، معاملہ بندی والے اشعار عام شعراء کے انتخاب میں شامل کر دیے گئے ہیں۔)

گھبرانا جو یاد آیا ترا ہو کے ہم آغوش　　گھبرانے لگا سینہ میں دم اور زیادہ
کل تک کے جو وصل کے عالم ہی نظر میں پھرتے　　آج تنہا خفقانی سے ہیں گھر میں پھرتے

۷۸ ابتدائی غزلوں کے چند اشعار

ان سے کچھ وصل کا ذکر اب نہیں لانا اچھا　　وہ جو کچھ کہیں تو تم بھی کئے جانا اچھا
تم نے دشمن ہے جو اپنا ہمیں جانا اچھا　　یار ناداں سے تو ہو دشمن دانا اچھا

یا

دمِ ذبح تیغ جفا میں جب تری بہتا آبِ حیات ہو　　تو شہید ناز کو کیونکہ پھر نہ حیات بعد ممات ہو

۷۹

تمنا نہیں ہے کہ امداد دل کو تپش کا صلہ ہو کہ مزد قلق ہو
یہی حق ہے قاتل اگر حق دلا دے یہ بسمل ترے پاؤں پر جاں بحق ہو
جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے گر اس میں زلفِ سرکش ہو
پھر زلف بنے وہ دستِ موسیٰ جس میں اخگر آتش ہو
کوئی ہے کافر کوئی مسلماں جدا ہر اک کی ہے راہِ ایماں
جو اس کے نزدیک رہبری ہے وہ اس کے نزدیک رہزنی ہو

مثال

سحر جو گھر میں بشکل آئینہ تھا میں تنہا نزار و حیراں
تو اک پری چہرہ حور طلعت بہ شکلِ بلقیس و ماہ کنعاں   وغیرہ

مثال

مشکل ردیف اور قافیوں کی صرف ردیف الف سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔
"سراغ پا، چراغ پا۔ باہمدگر دونوں جدا، ہم سفر دونوں جدا۔ تصویر دل میرا، شمشیر دل میرا، مقدر زیر پا، ساغر زیر پا۔ آغوش نقش پا، روپوش نقش پا۔ طوفاں چڑھا، بیاباں چڑھا، تھوڑا اٹکا، روڑا اٹکا۔ منڈیر کا، ٹھنگیر کا۔ بغل میں مارا، اجل میں مارا وغیرہ۔
ذوق نے ناسخ کی غزلوں پر بھی غزلیں کہیں۔ چند غزلوں کے مطلع یہ ہیں۔

شوق نظارہ ہے جب سے اس رخِ پرنور کا ۔۔۔ ہے مرا مرغ نظر پروانہ شمع طور کا
ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا ۔۔۔ خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا
تھی زلف تیری سنبلِ صحنِ چمن کی شاخ ۔۔۔ قطروں سے پر عرق کے بنی یاسمن کی شاخ

مشہور تھا کہ اس آخر الذکر قافیہ و ردیف میں کوئی نہیں کہہ سکتا۔ ذوق نے سہ غزلہ کہدیا (دیوان ذوق ص ۹۹)
قافیہ پیمائی کی چند مثالیں :-

چھوڑا نہ ایک دانہ اختر سحر تلک ۔۔۔ گردوں کو لگ گیا جو مزہ شب ٹھنگیر کا
کوٹھے پہ ان کے خوب بچے آج رات کو ۔۔۔ تھا ہاتھ آگیا جو سہارا منڈیر کا

یا

جلد آ وعدۂ دیدار پہ اے وعدہ خلاف ۔۔۔ کب تک اٹکا رہے دم آنکھوں میں تھوڑا اٹکا (وغیرہ)

اور جس غزل میں مشکل ردیف و قوافی نہ ہوتے تو ان کا جی شعر کہنے میں نہ لگتا۔

ایک آسان مصرع طرح پر شکایت کرتے ہیں

ذوق بازیچۂ طفلاں ہے سراسر یہ زمیں
ساتھ لڑکوں کے پڑا کھیلنا گویا ہم کو!

۱۲۔ چند مثالیں

ہر اک سے ہے قول آشنائی کا جھوٹا
وہ کافر ہے ساری خدائی کا جھوٹا

میں وہ شہید ہوں لب خندانِ یار کا
ہنستا رہے چراغ بھی میرے مزار کا

ہم نے جانا تھا کہ قاصد جلد لائے گا خبر
کیا خبر تھی جا کے واں خود بے خبر ہو جائیگا

شکل تو دیکھو مصور کھینچے گا تصویر یار
آپ ہی تصویر اس کو دیکھ کر ہو جائیگا

کیوں کہہ کے مکرتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کہہ جب تجھے کہتا ہوں کہ میں کچھ نہیں کہتا

تھے دو گھڑی سے شیخ جی شیخی بگھارتے
ساری وہ شیخی ان کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

جب وہ پوچھے کہ ہے غش کون میری چتون پر
میں کہوں میں! تو کہے پس کے چھری گردن پر

قاصد لکھوں لفافے کو خط غبار سے
تا جانے وہ یہ خط ہے کسی خاکسار کا

درد دل سے لوٹتا ہوں کس کو میرا درد ہے
ہوں میں لفظ درد جس پہلو سے دیکھو درد ہے

چند لفظی صناعیاں

پیرِ مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوق
نامرد، مرد، مرد جوانمرد ہو گیا

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں نہ ٹھہریگا
ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھہروں، نہ ٹھہریگا

راحت و رنج زمانہ میں ہیں دونوں لیکن
یاں اگر ایک کو راحت ہے تو ہے چار کو رنج

جا بجا کوہ کے چشموں سے رواں ہیں آنسو
ہے جو ناکامیِ فرہاد کا کہسار کو رنج

مرتا ہوں انتظار میں کوئی بشر تو بھیج
خط بھیج یا نہ بھیج زبانی خبر تو بھیج

پھر کر ادھر ادھر بھی نہ اپنا گیا قلق
لفظ قلق کی طرح سے یونہی رہا قلق

منھ سے لگا ہوا ہے اگر جام مے تو کیا
ہے دل سے یاد ساقی کوثر لگی ہوئی

بندش الفاظ

زاہد یہ کیا کہا کہ نہ مل ان بتوں سے تو
دیتا ہے ایسی بھی کوئی مرد خدا صلاح

یارب ہو دل کی خیر کہ کچھ کر رہے ہیں آج
چشم و نگاہ مشورہ ناز و ادا صلاح

اے ذوق جانہ ہوش و خرد کی صلاح پر
جو عشق دے صلاح وہی ہے بجا صلاح

۱۳ھ

مصرعے

ﷺ ایسی کیا جلدی ہے جلدی کام ہے شیطان کا
ﷺ سر پہ شیطان کے اک اور بھی شیطان چڑھا
ﷺ یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے
ﷺ یار ناداں سے دشمنِ دانا اچھا
ﷺ کافر کی شوخی دیکھو گھر میں خدا کے مارا
ﷺ یہ بھی ہو نگا کہ شہیدوں میں ملے گا
ﷺ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو
ﷺ پر سچ ہے حرامزادے کی رسی دراز ہے
ﷺ خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری
ﷺ آپ کی یونہی خوشی ہے مہرباں یونہی سہی
ﷺ مال موذی نصیب غازی ہے

سے بدگماں، وہم کی دار و نہیں لقمان کے پاس وغیرہ وغیرہ۔

۱۴ھ

حافظ ویران کی استدعا پر مرنے سے چند گھنٹے پہلے ذوق نے پاؤں تلے کی زمین نکل جانے کا محاورہ باندھا۔

زمیں کیا ہے فلک پاؤں کے نیچے سے نکل جائے
ہماری خاک پہ دکھلا دو رفتار سمند اپنی

جو دل سے اپنے دم آتشیں نکل جائے
فلک کے پاؤں تلے سے زمیں نکل جائے

۱۵ھ

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

رہا ٹیڑھا مثال نیش کژدم،
کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا

ذوق اس بحر جہاں میں کشتی عمر رواں
جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارہ ہو گیا

جو کچھ کہ ہوا ہم سے وہ کس طرح نہ ہوتا
حکم ازلی ذوق یونہی ہو ہی چکا تھا

موت نے کر دیا ناچار وگرنہ انساں
ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قایل ہوتا

منہ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے
گر انھیں آ کے خدا ساری خدائی دیتا

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا

اے ذوق ہوش اگر ہے تو دنیا سے دور بھاگ
اس میکدے میں کام نہیں ہوشیار کا

نہ پکڑیں دامن الیاس گرداب بلا میں ہم
کہ بدتر ڈوب مرنے سے ہی جینا اس سہارے کا

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے ہیں وہ جو تکلف نہیں کرتے

حلاوت شرم و پائداری جہاں میں ہے ذوق رنج و خواری
مزے سے گزری اگر گزاری کسی نے بے ننگ و نام ہو کر

واں سے یاں آئے تھے اے ذوق تو کیا لائے تھے
یاں سے تو جائیں گے ہم لاکھ تمنا لے کر

برق خرمن سوز ہے عالم میں نافہمی تری
ورنہ کیا کیا لہلہاتے کھیت ہیں ہر دانے میں

اس گلستانِ جہاں میں کیا گلِ عشرت نہیں
سیر کے قابل ہے یہ پر سیر کی فرصت نہیں

لیتے ہیں ثمر شاخِ ثمر ور کو جھکا کر
جھکتے ہیں سخی وقتِ کرم اور زیادہ

کہیے نہ تنگ ظرف سے اے ذوق کبھی راز
کہہ کر اسے سننا ہو ہزاروں سے تو کہیے

ثبات کب ہے زمانہ کے عز و شاں کیلیے
کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کیلیے

ہو عمر خضر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

کتنے مفلس ہو گئے کتنے تونگر ہو گئے
خاک میں جب مل گئے دونوں برابر ہو گئے

جس انساں کو سگِ دنیا نہ پایا
فرشتہ اس کا ہم پایا نہ پایا

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق
اولاد سے یہی تو ہے دو پشت چار پشت

سیراب نہ ہو جس سے کوئی تشنۂ مقصود
اے ذوق جو وہ آبِ بقا بھی ہے تو کیا ہے

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے
بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے

افسردہ دل کے واسطے کیا چاندنی کا لطف
لپٹا پڑا ہے مردہ سا گویا کفن کے ساتھ

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

جو فرشتے کرتے ہیں کر سکتا ہے انسان بھی
پر فرشتوں سے نہ ہو جو کام ہے انسان کا

اے صنم کیا پوچھتا ہے حال اس رنجور کا
دل نہ اٹکائے کہیں اللہ بے مقدور کا

ھ ۱۶

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا
آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

جہاں باریک بین و ناتواں ہیں اسقدر دیکھا
ہلال انتیسویں[۲۹] کا سب کو منظورِ نظر دیکھا

حق نے تجھکو اک زباں دی اور دیے ہیں کان دو
اس کے یہ معنی کہے اک اور سُنے انسان دو

ھ ۱۷

برہم اسے کیوں تو نے کیا چھیڑ کے پھر زلف
اے دل وہ ابھی چیں بجبیں ہو ہی چکا تھا

مسجد میں اس نے ہم کو آنکھیں دکھا کے مارا
کافر کی شوخی دیکھو گھر میں خدا کے مارا

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوقؔ
اپنی بلا سے اب کبھی باد صبا چلے

چمن میں کہتے ہیں پھر موسم عیش و طرب آیا
بہاریں خوب لوٹیں گے اگر وہ غنچہ لب آیا

دیکھ گر دیکھنا ہے ذوقؔ کہ وہ پردہ نشیں
دیدۂ روزنِ دل سے ہے دکھائی دیتا

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

اس نے خط جو قلم سرمہ سے لکھا ہم کو
لکھا ایمائے خموشی ہے یہ گویا ہم کو

زبان ریختہ کر دی زبان اہل ولایت کی
محبت ذوقؔ کو ازبسکہ ہے شاہ ولایت سے

ھ ۱۸

ستم کو ہم کرم سمجھے جفا کو ہم وفا سمجھے
اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اُس بت کو خدا سمجھے

حکایت دل کی کہتا ہوں سمجھتے ہو شکایت ہر
تمہیں سمجھو ذرا دل سے کہ سمجھے بھی تو کیا سمجھے

سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوقؔ اسکی
کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

کیا مد نظر ہے تمہیں یاروں سے تو کہئے
گر منہ سے نہیں کہتے اشاروں سے تو کہئے

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے — زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے
موذن مرحبا بر وقت بولا — تری آواز مکے اور مدینے
جو کہو گے تم کہیں گے ہم بھی ہاں یونہی سہی — آپ کی یونہی خوشی ہے مہرباں یونہی سہی
مٹ گئے جوہر وفا کے اٹھ گئے سب اہل دل — اب وفا ہے نام کو اور یا وفا کہنے کو ہیں

۱۹

دانت یوں چمکے ہنسی میں رات اس مہ پارہ کے — میں نے جانا ماہ تاباں پارہ پارہ ہو گیا
جھکائے ہے سر تسلیم ماہ نو پردہ — غرور حسن سے کس کا سلام لیتے ہیں
چاندنی دیکھے اگر وہ مہ جبیں تالاب پر — عکس رخ کی تاب پانی پھیر دے مہتاب پر
اس روئے تابناک پہ ہر قطرۂ عرق — گویا کہ اک ستارہ ہے صبح بہار کا
گزرتی عمر ہے یوں دور آسمانی میں — کہ جیسے جائے کوئی کشتی دخانی میں
بلبل ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر — پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

۲۰

ذوق زیبا ہے جو ہو ریش سفید شیخ پر — وسمہ آب تاک سے مہندی مے گلرنگ ہے
ذوق جو مدرسے کے بگڑے ہوئے ہیں ملا — ان کو مے خانے میں لے آؤ سنور جائیں گے
چلے ہیں دیر کو مدت میں خانقاہ سے ہم — شکست توبہ لیے ارمغاں بتاں کیلئے
اس بت پہ گر خدا بھی ہو عاشق تو اے رشک — ہر چند جانتا ہوں کہ وہ پاکباز ہے
اب ذوق بس نہ آپ کو صوفی جتائیے — معلوم ہے حقیقت حق جناب کی
چاہیے زر ان بتان سیم تن کے واسطے — یاں قلندر ہیں نہیں کوڑی کفن کے واسطے
شور قلقل یہ کیوں ہے دختر رز — کیا کسی آشنا سے لڑتی ہے

رات اک پگڑی ہوئی تھی میکدہ میں رہن مے
ذوق وہ تیری ہی دستار فضیلت ہو تو ہو

مسواک نے بڑھایا ہے زاہد کا اعتبار
ہے یہ بھی اُس کے اک شجر مکر و فن کی شاخ

ریش سفید شیخ میں ہے ظلمت فریب
اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گمان صبح

آدم دو دانہ سوئے بہشت بریں گیا
دیکھو جہاں خراب ہوا پھر وہیں گیا

ترا مکاں تو ہے کیا لامکاں میں کود پڑیں
امید وصل میں ہم بام عرش پر چڑھ کر

۱۲ھ

انتخاب کلام

آتی ہے صدائے جرس ناقۂ لیلیٰ
پر حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا

پردہ در کعبہ سے اٹھانا تو ہے آساں
یہ پردۂ رخسار صنم اٹھ نہیں سکتا

بلبلِ رنگِ خموشی سے جو دل ہو آگاہ
برگ گل میں لبِ اظہار نظر آتا ہے

الفت کا نشہ جب کوئی مر جائے تو جائے
یہ درد سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے

پھر بہار آئی کف ہر شاخ پر پیمانہ ہے
ہر روش پر جلوۂ باد صبا مستانہ ہے

مرض عشق جسے ہو اُسے کیا یاد رہے
نہ دوا یاد رہے اور نہ دعا یاد رہے

تم جسے یاد کرو پھر اسے کیا یاد رہے
نہ خدائی کی ہو پروا نہ خدا یاد رہے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

دنیا نے کس کا راہ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے

ہوتا نہ اگر دل تو محبت بھی نہ ہوتی
ہوتی نہ محبت تو یہ آفت بھی نہ ہوتی

پھول تو دو دن بہار جاں فزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

آلودہ اظہار نہ ہو راز محبت!
دم ہونٹوں پہ آجائے مگر میں نہ کہوں ہائے

تغافل سے فرصت نہیں واں نظر کو
یہاں منتظر لب پہ جانِ حزیں ہے

وہی ہے زمانہ وہی رات دن ہے
ق
وہی آسماں اور وہی زمیں ہے

نہ کی آہ تو زخم دل پر اٹھالے
تجھے آفریں ذوق صد آفریں ہے

تمہارا مجھ کو پاس آبرو تھا
وگرنہ اشک تھم جاتے ابھی سے

جا کے اک بار نہ پھرنا تھا جہاں واں مجھکو
بیقراری ہے کہ سو بار لیے پھرتی ہے

چپکے چپکے غم کا کھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
جی ہی جی میں تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

بیانِ درد محبت جو ہو تو کیونکر ہو!
زباں دل کے لئے ہے نہ دل زباں کیلئے

امید ہو گئی ہمسایہ ورنہ خانۂ یاس
بہشت تھا ہمیں آرام جاوداں کیلئے

تجھکو کچھ یاد بھی ہیں پہلی وہ الفت کے مزے
بے مزہ ہونے کے لطف اور شکایت کے مزے

غنچے تری غنچہ دہنی کو نہیں پاتے
ہنستے تو ہیں پر تیری ہنسی کو نہیں پاتے

ہے ان کا سادہ پن بھی تو کس کس پھبن کیساتھ
سیدھی سی بات بھی ہو تو اک بانکپن کیساتھ

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

مرتے ہیں ترے پیار سے ہم اور زیادہ
تو لطف میں کرتا ہے ستم اور زیادہ

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی ترے سب کے جواب میں

وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

اے دل وہ تیر غمزۂ پنہاں عیاں نہ کر
آنکھوں سے دیکھ اور زباں سے بیاں نہ کر

آنا تو خفا آنا جانا تو خفا جانا
آنا ہے تو کیا آنا جانا ہے تو کیا جانا

سب کو دیکھا اس نے اور اسکو نہ دیکھا جوں نگاہ
وہ رہا آنکھوں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

مجھ میں اسمیں ربط ہے گویا بہ رنگ بو و گل
وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا

اِس تپش کا ہے مزا دل ہی کو حاصل ہوتا
کاش میں عشق میں سرتا بقدم دل ہوتا

میں وہ ہوں صید کہ پھر دام میں پھنستا جاکر
گر قفس سے مجھے صیاد رہائی دیتا

ذوق کے مرنے کی سنکر پہلے تو چپ ہو گئے
پھر کہا تو یہ کہا منھ پھیر کر اچھا ہوا

چند منتخب غزلیں جو ذوق کے مذاق کو ظاہر کرتی ہیں ۔

اسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا
اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا

جس انساں کو سگِ دنیا نہ پایا
فرشتہ اس کا ہم پایہ نہ پایا

مقدر ہے یہ گر سود و زیاں سے
تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا

لحد میں بھی ترے مضطر نے آرام
خدا جانے کہ پایا یا نہ پایا

جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا
کہیں ہم نے تجھے تنہا نہ پایا

وہ از خود رفتہ ہوں جس کو خودی نے
خدائی میں اگر ڈھونڈا نہ پایا

کبھی تو اور کبھی تیرا رہا غم
غرض خالی دلِ شیدا نہ پایا

نظیر اس کا کہاں عالم میں اے ذوق
کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا

جینا ہمیں اصلا نظر اپنا نہیں آتا
گر آج وہ رشک مسیحا نہیں آتا

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہا دیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

آیا ہے دم آنکھوں میں دم حسرتِ دیدار　　پر لب پہ کبھی حرفِ تمنا نہیں آتا
آنا ہے تو آ جا کہ کوئی دم کی ہو فرصت
پھر دیکھیے آتا بھی ہے دم یا نہیں آتا

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا　　جو آپ ہی مر رہا ہو اُس کو گر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا　　نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا
نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا　　اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا
ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا　　کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا
گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے　　اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا
دلِ بد خواہ میں تھا مارنا یا چشمِ بد بیں میں
فلک پر ذوقؔ تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

سر بوقتِ ذبح اپنا اُس کے زیرِ پائے ہے　　یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے
رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے　　مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے
بس کہ گرم سوزِ دروں بھن جائینگے دل اور جگر　　رحم جوشِ گریہ چھاتی پھر ابھی بھر آئے ہے
بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے　　اف رے بیتابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے
نزع میں بھی ذوقؔ کو تیرا ہی بس ہے انتظار
جانبِ در دیکھے ہے جبکہ ہوش آ جائے ہے

قطعہ

کہوں کیا ذوقؔ احوالِ شبِ ہجر — کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر — مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
تپِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم — اور آتے تھے پسینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے — کہ او بے مہر بد اختر کمینے
کہاں ہیں اور کہاں یہ سب مگر تھے — مری جانب سے تیرے دل میں کینے
سو اس ظلمت کے پردے میں کئے ظلم — ارے ظالم تری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج — پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے — قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سنکر — پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اٹھایا گاہ ہے اور گاہ بٹھایا — مجھے بے تابی و بے طاقتی نے
کہا عیب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ — بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ — بہت سی جان توڑی جانکنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی — طلوعِ صبح سے منہ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات — یقیں ہے صبح تک دیگی نہ جینے
لگے پانی چوانے منہ میں آنسو — پڑھی لیسیں سرہانے بیکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی — لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریب خانہ میرے — اذاں مسجد میں دی یارے کسی نے
بشارت مجھ کو صبحِ وصل کی دی — اذاں کے ساتھ مؤذن فرخی نے

ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر
کہ خوش ہو کر کہا یہ خود خوشی نے

موذن مرحبا بر وقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

قصائد

چند تشبیہیں:-

یوں کرسی زر پہ ہے تری جلوہ نمائی
جس طرح کہ مصحف ہو سرِ رحلِ طلائی

پہنچا کمکِ لشکر باراں سے ہے یہ زور
ہر نالے کی ہے دشت میں دریا پہ چڑھائی

زنجیر میں جو ہر کے رہے تیغ ہمیشہ
خونریز کو ہو عہد میں تیرے نہ رہائی

بعد شاہانِ سلف کے ہے تجھے یوں تفضیل
جیسے قرآں پس توریت و زبور و انجیل

گاہ خم میں ہے گہے شیشے میں کیا کیا پے سیر
روح کرتی ہے کسی مست کی قالب تبدیل

تشبیب

سحر جو گھر میں لشکلِ آئینہ تھا میں تنہا نزار و حیراں
تو اک پری چہرۂ حور طلعت لشکلِ بالقیس ماہ کنعاں

پری کی صورت چمن کی رنگت گر اس کا شیوہ تو اس کا جلوہ
زباں شیریں بیاں رنگیں کلام رنداں خرام مستاں

انیس خلوت جلیس جلوت حریف حکمت ظریف صحبت

بہ بزم یاراں بدل بہاراں یہ اہل عزلت سگے بلاں

جبیں بشکل مہ منور عرق کے قطرے ہیں سیمیں اختر

ہلال ابرو نگاہ جادو خدنگ مژگاں وچشم فتاں

بروے رنگیں نگار لبتاں شگوفہ خنداں مگر نہ خنداں

بموے پیچاں سے عشق پیچاں جو ہیں پریشاں تو دل پریشاں

وہ گوش پر زیب جھمکا ہی جو دیکھو بنی تو یا الٰہی

دہن میں غنچہ لبوں میں گلبرگ بروے روشن میں ماہ تاباں

نگاہ ساغر کش تماشا بیاض گردن صراحی آسا

وہ گول بازو وہ گورے ساعد وہ پنجہ رنگیں بخون مرجاں

کمر نزاکت سے لچکی جائے کہ ہے نزاکت کا بار اٹھائے

اور اس پہ سو نور لہر کھائے پھر اس پہ ہیں دو قمر فروزاں

وہ ران روشن وہ ساق سیمیں وہ پائے نازک حنائیں رنگیں

وہ قد قیامت وہ فتنہ قامت دلوں پہ شامت جو ہو خراماں

جو نام پوچھا کہا خوشی ہوں جو وصف پوچھا تو دلبری ہوں

بہت جو پوچھا تو ہنس کے بولا کہ ذوق تو بھی عجب ہے ناداں

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

مزے لیتا تھا پڑا علم و عمل کے اپنے تھا تصور مرا ہر امر میں تصدیق صفت

ہو گیا علم حصولی تھا حضوری مجھ کو تھا مرا ذہن نہ محتاج حصول صورت

کبھی ہمت تھی میری قاعدۂ صرف میں صرف
کبھی تھی نحو میں ہر نحو مجھے محویت
کبھی تعلیم عقائد بہ کتاب و سنت
کبھی کرتی تھی طبیعی میں طبیعت جودت
کبھی کرتا تھا قدم چرخ کا ثابت بجہاں
اور کبھی کرتا تھا باطل بسماء نشقت
کبھی انکار قیامت پہ میں لاتا تھا دلیل
کبھی تکرار و تناسخ پہ مجھے سوجھت

زہے نشاط اگر کیجئے اسے تحریر
عیاں ہو نامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر
زباں سے ذکر اگر چھیڑیئے تو پیدا ہو
نفس کے تار سے آواز خوشتر از بم و زیر
ہوا یہ باغ جہاں میں شگفتگی کا جوش
کلید قفل دل تنگ خاطر دل گیر
کرے ہے وا لب غنچہ دو ہزار سخن
جو وا ہو غنچۂ منقار بلبل تصویر
اثر سے باد بہاری کے لہلہاتے ہیں
زمیں پہ ہمسر سنبل ہے موج نقش حصیر
نکل کے سنگ سے گر ہو شرارہ تخم فشاں
تو سبز فیض ہوا سے ہو وہ برنگ شعیر
زمیں پہ گرتے ہی دے آئے دانہ برگ و ثمر
جو ٹوٹے ہاتھ سے زاہد کے سبحۂ تزویر
ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابر سیاہ
کہ جیسے جائے کوئی پیل مست بے زنجیر

ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی
کرتا ہے ہلال ابروئے پرخم سے اشارہ
ساقی کو کہ بھر بادہ سے کشتی طلائی
ہے عکس فگن جام بلوریں سے مے سرخ
کس رنگ سے ہوں ہاتھ نہ میکش کے حنائی
کوندے ہے جو بجلی تو یہ سوجھے ہے نشہ میں
ساقی نے ہے آتش سے مے تیز اڑائی
ہے قلزم حماں پہ لب جو متبسم
تالاب سمندر کو کرے چشم نمائی

کرتی ہے صبا آکے کبھی مشک فشانی ۔ کرتی ہے نسیم آکے کبھی لخلخہ سانی
ہے نرگس شہلا نے دیا آنکھ میں کاجل ۔ برگِ گل سوسن نے دھڑی لب پہ جمانی

گریز :۔

بہادر شاہ ظفر کی صحتیابی پر جو قصیدہ لکھا اس کی تشبیب میں دنیا جہان کی تندرستی کا ذکر کرتے ہوئے آخر اس طرح گریز کرتے ہیں۔

واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کو ہو
جبکہ ہو اسکی نوید غسلِ صحت جانفزا

"شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت" والے قصیدے میں "نوید بہجت" مجسم نظر آئی تو اس نے خواب راحت سے جگانا شروع کیا محض اس لئے کہ :۔

فکر تہنیت عید کا اُس شاہ کی تو ۔ دور میں جسکے ہو ہر صبح صباح دولت
وہ شہنشاہ بہادر شہ کسریٰ انصاف ۔ خسرو جم خدم و داور دارا حشمت

اسی طرح "ایک خورشید لقا طرفہ جوان ارشق" اُن کو اس طرح سمجھاتا ہے کہ ۔

تو بھی کر تہنیت عید کا اُس کی سامان
کہ ہے وہ خسرو دیں حامیِ دینِ برحق

دُعا کا طرز :۔

الٰہی آب پہ ہوتا زمیں، زمیں کو ثبات ۔ زمیں پہ تا ہو فلک اور فلک کو ہو تدویر

فلک پہ چھوڑے نہ تا دامن مسیح حیات | زمیں پہ خضر کی ہوتا نہ دامن گیر
عطا کرے تجھے عالم میں قادر قیوم | بجاہ و دولت و اقبال و عزت و توقیر
تن قوی و مزاج صحیح و عمر طویل | سپاہ و افسر و ملک وسیع و گنج خطیر

یا

تا رہے پنجۂ خورشید پہ ہر روز طلا | تا گرہ میں رکھے شب عقد ثریا گوہر
دانۂ انجم گردوں سے پروئے جبتک | رشتۂ کاہکشاں میں شب یلدا گوہر
جب تلک جوش بہاراں سے ہوئے دامن صبح | ٹانکے شبنم سے سر دامن صحرا گوہر
ہر برس جشن ترا تجھ کو مبارک ہووے | برسیں نیساں کرم سے ترے شاہا گوہر
دوستوں کو ہو ترے گنج گہر روز نصیب | ہو نہ جز اشک سر دامن اعدا گوہر

دعائیہ قصیدے کا مطلع یہ ہے ؎

سریر آرائے گردوں جب تلک سلطان خاور ہو
قمر دستور اعظم صدر اعلیٰ سعد اکبر ہو!
عطارد میر منشی زہرہ ناظر آسماں پر ہو
زحل میر عمارت تیرا گردوں میر لشکر ہو!
سر ہفت آسماں جبتک کہ دور ہفت اختر ہو
الٰہی یہ بہادر شاہ شاہ ہفت کشور ہو

چند سنگلاخ زمینوں کے مطلعے :-

پائے نہ ایسا ایک بھی دن خوشتر آسماں | کھائے اگر ہزار برس چکر آسماں

ہے آج جو یوں خوشنما نورِ سحر رنگِ شفق   پرتو ہے کس خورشید کا نورِ سحر رنگِ شفق

ایک خورشید لقا طرفہ بجا اِن ادر شفق   تاب رخسار خلق سرخیٔ رخسار شفق

ہیں مرے آبلۂ دل کے تماشا گوہر

اک اگر ٹوٹے تو ہوں کتنے ہی پیدا گوہر

مومن کی غزلگوئی

مومن بہت سی باتوں میں اپنے ماحول سے الگ ہیں کہیں تو اسی پر ترقی کی ہے اور کہیں اپنی انفرادیت الگ قائم کری ہے پہلی بات تو ان کا اپنا غزل کا نظریہ ہے، ان کے نزدیک غزل کو محض اس کے لغوی معنوں میں برتنا چاہیے یعنی غزل کو انھیں مضامین پر محدود کر دینا چاہیئے جو عشق و عاشقی کی واردات سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس اصول کو جو غالباً ان کی عربی کی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ مومن خاں نے اپنے کلام میں آخر تک بڑی سختی سے برتا، یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ہم کو وحدت الوجود ہمہ اوست یا ہمہ از وست کے مسئلے نہیں ملتے، تصوف کی خیالی بلندیوں پر چڑھنا نہیں ہوتا۔ اور فلسفہ کی پرپیچ دقتوں سے ہم باز رکھے جاتے ہیں ان کے یہاں محض عشق و عاشقی ہے معاملہ بندی اور معشوق سے چھیڑ چھاڑ کی باتیں ہیں اور معشوق بھی اسی دنیا کا۔

در اصل مومن کا یہ نظریہ کئی اثرات کا نتیجہ ہے۔ ایک تو عربی میں غزل کی تعریف دوسرے ان کی خود نہایت عاشقانہ طبیعت اور تیسرے (اس وجہ سے) اُن پر

جرأت کا اثر۔ عربی میں غزل معشوق سے میٹھی باتیں کرنے کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی باتیں عاشقانہ اور لطف و تفریح کی ہوں گی اسی لیے مومن طبعیتاً اسی طرف راغب ہوئے اور غزل کو اصولاً اسی معنی میں برتنے لگے۔ چونکہ جوانی جوانیوں میں کٹی تھی اس لیے اس کوچہ سے خوب واقف تھے۔ اور واقعی طبیعت پر ظلم کرتے اگر وہ معاملہ بندی کی طرف نہ آتے۔ لازماً جرأت کا رنگ آگیا اس کو وہ خود بھی مانتے تھے لیکن جرأت میں اور ان میں کافی فرق ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ جرأت کا ماحول تمام تر رنگ رلیوں کا شیدائی تھا۔ کیا بادشاہ کیا فقیر ہر ایک پر سرخوشی چھائی ہوئی تھی۔ لکھنؤ مرفہ حالی کے لحاظ سے اپنے شباب پر تھا۔ اور بادشاہ کے اثر سے لوگوں کے طبائع اور شاعری دونوں پر مستی چھائی ہوئی تھی۔ صلحا اور زہاد کی پگڑیاں اچھالی جاتی تھیں اسی لیے جرأت کی شاعری ایک بے دھڑک چوماچاٹی نظر آتی ہے۔ مومن کا ماحول اس کے برخلاف مفلس اور مولویانہ تھا۔ اس لیے جو بات مومن کو کہنا ہوتی وہ سنجیدگی اور علمیت کے پردے میں کہنا پڑتی تھی۔ کیونکہ سامعین اور نقاد ایسے ہی لوگ تھے۔ اس کے علاوہ دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ جرأت خود زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے اس لیے بیشتر کھل جاتے تھے۔ مومن برخلاف اس کے علوم متداولہ میں کافی وقوف رکھتے تھے لازماً ان کو اپنے پڑھے ہونے کا بھرم رکھنا ہی پڑتا تھا۔ اس لئے پردے پڑے رہتے تھے اور قیس محمل کے گرد چکر کاٹا کرتا۔

عوام کی تقلید اور پابندی کے لحاظ سے جس کے مومن خلاف تھے یہ تغزل کا نظریہ ایک جدت کہا جا سکتا ہے لیکن مضامین کے لحاظ سے مومن نے اپنے تغزل میں وہی مسلمات برقرار رکھے جو اس زمانہ میں مروج اور عام تھے ان کی

اس تقلید نے ان کے تغزل کو بڑی حد تک محدود بنا دیا ہے۔ حالانکہ مضامین کی اس محدود دنیا میں انھوں نے کافی جولانیاں اور نازک خیالیاں دکھائی ہیں لیکن یہ معلوم ہوتا ہے گویا ایک محدود آسمان یا ایک محدود فضا ہے جس میں وہ بجلیاں چمکایا کرتے ہیں اور اس سے سرمو تجاوز نہیں کرتے، یہ نہیں کرتے کہ کبھی اس فلک کو توڑ کر باہر نکلیں اور اپنا آشیانہ اس عرش سے پرے بنانے کی کوشش کریں یہی وجہ ہے کہ انکا کلام پڑھتے وقت مسلمات شاعری کا ایک خاص کا ئرسرا اوڑھ لینا پڑتا ہے جس میں مضامین اور تصورات دونوں محدود ہیں اگر کوئی نازک خیالی، ندرت اسلوب یا شوخی ادا برتی جاتی ہے تو اسی محدود دائرے کے اندر۔

۵

مومن رعایت لفظی اور ایہام کے عاشق ہیں اور اس حیثیت سے اپنے دور کے پابند۔ شاہ نصیر کے شاگرد رہ چکے تھے، اور ناسخ کے ماننے والوں میں سے تھے غالباً اسی لئے ان پر یہ رنگ چڑھ گیا تھا حالانکہ انھوں نے اس دور کے اور دیگر خصوصیات قبول نہیں کئے مثلاً محاورہ بندی، سنگلاخ زمینیں (ان کو چھوڑ کر جو دیوان سازی کے لئے کہی گئیں) لیکن رعایت لفظی کو وہ قادر الکلامی کی پہچان سمجھتے تھے۔ وہ اس کو اصل غایت تو نہ سمجھتے تھے لیکن عیار استادی کا ایک ضروری جزو ضرور گردانتے تھے اور یہی مومن اور ذوق کی رعایت لفظی کا فرق ہے کہ اول الذکر معانی آفرینی کو پیش نظر رکھتے تھے۔ اور رعایت لفظی کو مقصود شعری نہیں بناتے تھے۔ موخر الذکر کا نظریہ بالکل برعکس ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مومن نے

ابتدا میں نصیر و ناسخ کے اثر سے اکثر اشعار محض رعایت ہی کی خاطر لکھے ہیں لیکن بعد کو یہ صرف ایک طریقہ اظہار کا رہ گیا تھا نہ کہ مقصود اظہار، لیکن پیچھا عمر بھر نہ چھوٹا

۲

در اصل مومن کا مسلک معنی آفرینی اور نزاکتِ خیال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن کی شاعری ذاتی رجحانات اور خارجی معیار و مذاق شعری کی کش مکش کا ایک عجیب مرقع ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری گنجلک سی نظر آتی ہے۔ یہ مرد میدان آخر تک اپنا میدان پا نہ سکا۔ کبھی زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے رعایت لفظی و خارجی حسن شعر پر مائل ہو جاتا کبھی اپنی ذاتی افتاد سے مجبور ہو کر اپنے خدا داد زور تخیل و نزاکت تخیل کو کام میں لائے بغیر نہ رہ سکتا، کبھی علمیت، دہلوی سنجیدگی اور متانت کا نقشہ پیش کرتا۔ لیکن اپنی طبیعت کی شوخیوں کو کہاں لے جاتا جو اس مصنوعی متانت کو چاک کر ڈالنا چاہتی تھیں۔ مختصر یہ کہ پیشہ اور ظاہری رکھ رکھاؤ اور برتاؤ فاضلانہ تھا۔ لیکن طبیعت شاعرانہ اور تخیلی تھی۔ مومن اس کشاکش میں ایک لائحہ عمل اپنے لئے بنانا چاہتے تھے اور یقیناً ایک خوشگوار روپیہ اختیار کر لیتے اگر ان کی زندگی جلد نہ ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں کبھی تو غالب کی طرح تقلید سے نفرت، جدت کا شوق اور نزاکت تخیل سے رغبت ملتی ہے اور کبھی ذوق کی طرح محض الفاظ کے الٹ پھیر میں دقت نظری۔ نتیجہ۔ ایک قسم کی گنجلک جسے ہم ان کا خاص رنگ کہتے ہیں۔ ان کے یہاں نہ تو لکھنوی حسن زبان ہے، نہ دہلوی حسن بیان۔ مومن اپنے ماحول سے باوجود اپنی بلند صلاحیتوں کے بلند نہ ہو سکے۔ اس لئے اپنے اسلوب کے لحاظ سے ان کو ذوق اور غالب کے درمیان کی ایک کڑی کہہ سکتے ہیں

بعض طبائع دقت پسند ہوتی ہیں اور ان کو گرہیں ڈالکر کھولنا اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سے اُن کی قدرت گرہ کشائی کی نمود ہوتی ہے۔ مومن یقینی اس قسم کے لوگوں میں سے تھے۔ ان کی نازک خیالی، مضمون آفرینی اور دقت نظری اسی سبب سے وجود میں آئی پھر متاخرین شعراء فارسی کے مطالعہ سے اور مغلق و دقیق ہوتی گئی۔ یہ گنجلک یا اغلاق مومن کے یہاں عموماً مبالغہ کے دور از کار ہونے یا ایہام و رعایت لفظی پر شعر کے مبنی ہونے یا استعارہ در استعارہ کے استعمال یا کسی وسیع خیال کو مختصر کرنے کی خواہش سے (جس کی وجہ سے اکثر بیچ کے الفاظ حذف کر دینا پڑے ہیں) پیدا ہوتے ہیں اس طرح گویا انھوں نے اپنے تخیل کو بھی ایک فن بنالیا تھا۔ اور تعجب یہ کہ اپنے جذباتی شعروں میں بھی یہ التزام قائم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار محض معمے ہو کر رہ گئے جن کو حل کر لینے پر بھی کوئی خوشی محسوس نہیں ہوتی اس لیے کہ انکا تعلق نفسیات بشری سے نہیں بلکہ عقلیات سے ہوتا ہے فطرت انسانی کی تڑپ نہیں ہے فکر و جدت ادا کی پیچیدگیاں ہیں۔

شاعری اپنی ہوئی نیرنگی دانش وری
جو سخن ہے سو طلسم راز بطلیموس ہے

اور یہی غالب اور مومن کے درمیان بڑا فرق ہے غالب کے مشکل اشعار حل کر لینے پر خوشی محسوس ہوتی ہے اور کائنات یا فطرت انسانی کے کسی نہ کسی راز کا علم حاصل ہوتا ہے لیکن مومن کی گتھیاں سلجھانے پر محض گتھیوں کا سلجھانا ہاتھ آتا ہے۔ مومن کے ایسے اشعار گویا اُن کے شطرنج کے نقشے ہیں جن کے حل کرنے پر صرف اس بات کی خوشی ہوتی ہے کہ وہ حل ہو گیا کوئی لطف خاص حاصل

نہیں ہوتا یا دوسرے الفاظ میں اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مومن کے یہاں تصنع آمیز پیچیدگی اور دقت نظر ہے علوِ تخیل اور بلندی فکر نہیں۔

بظاہر مومن توبہ کرچکے تھے لیکن جن باتوں سے انھوں نے توبہ کی تھی انھیں اب شعر کا روپ دید یا تھا یہی وجہ ہے کہ مومن معاملہ بندی کے معاملات میں اپنے صحیح رنگ میں نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ماحول اور علمیت کی وجہ سے متانت کا رکھ رکھاؤ برتتے ہیں لیکن طبیعت کو نہیں مارتے۔ ان کا عشق مجازی بوالہوسی کی طرف مائل ہے لیکن پستی اور ابتذال کم ہے۔ اور ان کے معاملے بیشتر کسی پردہ نشیں سے ہیں۔ معاملہ بندی دراصل گرمیٔ تصورات کا نتیجہ ہے اس لئے اس بیان میں تسلسل ہو تو خوب ہے۔

۳

مومن کی معاملہ بندی میں تسلسل اکثر ملتا ہے خصوصاً جب وہ خود اپنے کسی معشوق سے خفا ہو جاتے ہیں۔ مومن اور جرأت کی معاملہ بندی میں ایک خاص فرق یہ بھی ہے کہ مومن اپنے کئے کو بُرا سمجھنے لگے تھے، جرأت بر خلاف اس کے اسی کو اچھا سمجھتے تھے۔

۴

طنز و تعریض اور مکرِ شاعرانہ جو محبت اور بوالہوسی کے خاص چونچلے ہیں، اسی معاملہ بندی کے تحت ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ طبیعت کی مناسبت کی وجہ سے مومن نے اس میں دادِ سخن خوب دی ہے اور جب وہ اس میدان میں قدم رکھتے ہیں تو متانت اور بزرگی کی وہ مصنوعی قبا جو انھوں نے پہن رکھی ہے

شانوں پر سے کھسکتی نظر آتی ہے۔

۵

ایک قسم کی مصنوعی ظرافت جو اس زمانہ کی خصوصیات میں سے ہے مومن کے یہاں فطری بھی ہے اور شوخ بھی، یعنے واعظ، ناصح اور زاہد کی جس کامیابی سے اور جتنا جی کھول کر دھجیاں انھوں نے اڑائی ہیں اتنی کامیابی غالباً کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ اس کی وجہ خاص یہ تھی کہ اُن کے دل میں بھی ایک سخت اور کٹّر ناصح بسا ہوا تھا۔

۶

کلام مومن کی شعریت میں ان کے تعقیدی طرز کے علاوہ ایک دو باتیں اور بھی حائل ہو جاتی ہیں یعنی ان کی علمیت اور مذہبیت۔ علمیت کی وجہ سے وہ اکثر اوقات اپنے شعر میں کسی نہ کسی علم کی اصطلاح لے آتے ہیں جس کی وجہ سے شعر کا سمجھنا یا شعر کا حل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ان کی شعریت ان کی علمیت پر ضرور غالب ہے پھر بھی جب کبھی وہ شعر بناتے ہیں تو یہ علمیت ضرور دخیل ہو جاتی ہے۔ تصوف میں اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ (اور اس لیے ان کا معشوق زمین ہی پر رہتا تھا ورنہ وہ شعر میں مذاق زمانہ کے مطابق خوب کھپ جاتا۔ اور یہ خشک علمیت گراں نہ گزرتی) مذہبیت دوسرا روڑا تھا۔ تمام خاندان ان کا سخت کٹّر قسم کا مسلمان۔ خود موحد، عامل بالحدیث اور بیعت کے بعد اور بھی سخت ہو گئے تھے۔ چنانچہ اکثر و بیشتر مذہبی اصطلاحیں بھی آ جاتی ہیں کبھی تو علانیہ یا اشاروں میں، دوسرے مذاہب والوں پر سودا کی طرح

چوٹیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ یہ سب باتیں مناظرے یا وعظ میں ہوں تو لطف دیتی ہیں، شاعری میں اکثر بے جوڑ معلوم ہوتی ہیں۔

مرزا داموممن کا خاص گر اور جوہر ہے جب کبھی رعایت اور صنائع کے پیچ سے اس طرف آتے ہیں تو اپنے خاص رنگ میں ہوتے ہیں۔ ندرت اسلوب کی خاصکر ان کے یہاں بے حد فراوانی ہے کبھی نادر تشبیہیں اور استعارے لاتے ہیں۔ کبھی کسی امر کو مسلم مان کر اس کی طرف خفیف سا اشارہ کر دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی ندرت اسلوب بجائے لطیف ہونے کے دقیق زیادہ تھی۔ البتہ شوخی ادا میں خوشگوار شوخیاں کھاتی ہیں۔ ان کی جدید فارسی ترکیبیں ان کی مشکل پسند طبیعت اور فارسی دانی کا نتیجہ ہیں یہ ان کے کلام میں جگہ بہ جگہ ملتی ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ اکثر خوب ہیں۔ لیکن بیشتر لائی ہوئی ہیں، نہ کہ آئی ہوئی۔ اسی لیے زواں اور رائج نہ ہو سکیں ان کی ترکیبوں اور غالب کی ترکیبوں میں یہی فرق ہے۔ جدید ترکیبیں وہ بھلی معلوم ہوتی ہیں جو جوش تصور سے بن جائیں نہ کہ وہ جو ایک ریاضی داں سوچ کر نکالے۔ شاعری میں عموماً ترکیب کی جدت، جوش تصور یا وسعت تصور کو چند الفاظ میں محصور کر دینے کی تدبیر ہوا کرتی ہے خواہ وہ کسی تشبیہ کی بابت ہو یا کسی واقعہ کی بابت۔ مومن کا جوش تصور تعقید پسند تھا نہ کہ وسعت پسند اس لئے ان کی تشبیہوں میں حرکت نہیں ہے اور اسی لئے ان کی تراکیب بھی اتنی روشن اتنی جاندار اور اتنی دلکش نہیں ہیں جتنی غالب کے یہاں۔

مومن اپنے مقطع سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کیونکہ لفظ مومن کی

رعایت سے بت پرستی اور کافر پرستی کے مضامین نہایت آسانی اور خوبی سے لائے جا سکتے ہیں۔

مومن عرصہ تک روشناس نہیں ہو سکے جس کی خاص وجہ ان کی تعقید بھی اس کے علاوہ انھیں حالی یا آزاد جیسا شاگرد نہ ملا۔ جو موجودہ طرز تنقید کے مطابق انھیں روشناس کر دیتا بلکہ صاحب آبِ حیات، گلستانِ بے خزاں نے تو ان کے کمالات پر شروع میں پردہ ہی ڈال دیا تھا لیکن اب جبکہ مومن روشناس ہو گئے ہیں انھیں بعض حلقوں میں غالب کے برابر ٹھہرایا جاتا ہے یہ بھی زیادتی ہے دونوں کے طبائع مختلف، افتادِ مزاج جداگانہ، ایک کر کے توبہ کرنے والا، دوسرا توبہ کرنے کو اپنی ہتک سمجھنے والا۔ ایک کٹر مومن مسلمان دوسرا صرف انسانیت میں اعتقاد رکھنے والا، تغزل کا نظریہ بھی جداگانہ۔ مومن کی غزلوں میں محض تغزل ہے۔ غالب کے یہاں تنوع جذبات کے علاوہ تصوف، اعتقادات فکر و فلسفہ بھی ہے یعنی تخیل کے میدان میں ایک محدود ہے دوسرا لا محدود۔ ایک کے یہاں بے چین روح ہے دوسرے کے یہاں محض کاوش دماغ ایک کا تخیل تمام نفسیات انسانی کی سیر میں مصروف ہے دوسرے کا محض ایک ہی جذبہ کے تلطف میں گرہ در گرہ ایک کی زندگی تمام تر بے چینی سے عبارت ہے۔ دوسرے کی زندگی تمام تر منظم۔ یعنی مومن قانع بھی تھے اور ہر حیثیت سے مطمئن بھی جذبات آسودہ اعتقادات مستحکم اور اٹل۔ ظاہر ہے کہاں وہ روح پریشاں کہاں یہ قلب مطمئن۔ مومن اگر عمر طبعی پاتے تب بھی غالب تک نہ پہنچ سکتے۔ بعض جگہ یہ صحیح ہے کہ ہم طرحی

غزلوں میں مومن کے اشعار غالب کے اشعار سے کم رتبے کے نہیں معلوم ہوتے یا بعض فارسی ترکیبیں مومن کی بھی کم عمدہ نہیں ہیں لیکن اُن اشعار میں خوبی محض فن کی ہے جس میں مومن اُس زمانہ کے معیار کے مطابق غالب سے کم نہ تھے لیکن تنوع مضامین اور طرفگی ادا کی مقابلتہً کمی کی وجہ سے اب مومن اور غالب کے مقامات نہایت آسانی سے مقرر کیے جا سکتے ہیں۔ رہا یہ امر کہ دونوں کی دماغی قابلیتیں، صلاحیتیں عام سطح سے بہت بلند تھیں ایک مسلّم حقیقت ہے لیکن روش دونوں کی جدا گانہ تھی، ورنہ ایسے تو جو بھی عشق کرتا اور شعر کہتا ہے مسائل اور مضامین تو ایک جیسے درپیش ہو ہی جاتے ہیں۔

رعایت لفظی اور ایہام

۱

شاید کہ دن پھرے ہیں کسی تیرہ روز کے	اب اُس گلی میں غیر نہیں پھرتے شام کو
آئے وہ دست غیر میں دیے ہاتھ	ہائے اس ٹوٹی شکستہ پائی کی
اُس پری وش سے لگاتے ہیں مجھے	لوگ دیوانہ بناتے ہیں مجھے
لے گئی جاں یادِ رونق ہائے وصل	گھر مرا ویراں ہوا تعمیر سے
کشادِ دل پہ باندھی ہے کمر آج	نہیں خیر آپ کے بند قبا کی
منہ کو نہ سیا ناصح کی بخیہ گری آتی	ہوں میں بھی ابھی لیتے ہیں پردہ دری آتی
پاس دیکھو کہ غیر سے کہہ دی	بات اپنی امیدواری کی
اب اور سے لو لگائیں گے ہم	جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

سرِ دوش عدو پہ رکھ کے بیٹھے — جانا کہ نہ سر اٹھائیں گے ہم
دل دے کے اک اور لالہ رو کو — ہر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم
گر خواب میں بھی اُدھر کو دیکھا — آنکھیں مژہ کو دکھائیں گے ہم
گر دیکھ کے ہنس دیا ہمیں تو — منہ پھیر کے مسکرائیں گے ہم
پھر تیری ہوا کا دم بھرا تو — جی ہی کو ہوا بنائیں گے ہم
آتا ہے گلے سے دھیان تیرے — خاطر میں ستم نہ لائیں گے ہم
برباد نہ جائے گی کدورت — کیا کیا تری خاک اڑائیں گے ہم
بگڑے تو کریں گے اور سے صلح — تجھ پر بھی بری بنائیں گے ہم
لب کا ترے دعوی مسیحی — مُردوں پہ آزمائیں گے ہم
گر تیری طرف کو بے قراری — کھینچے گی تو ٹوٹ جائیں گے ہم
کیا ذکر ہے ہونٹ چاٹنے کا — کچھ اور مزہ چکھائیں گے ہم
گر خواب میں آن کر جگایا — سوتے مُردے جگائیں گے ہم

بت خانۂ چین ہو گر ترا گھر
مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک — شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو
اُس لبِ لعل کی حکایت ہے — کیونکر رنگیں نہ ہو کلام مرا
آخر اشکوں کے بھر آنے نے ڈبو یا ہی مجھے — چشم کا سوراخ تو کشتی کا روزن ہو گیا

ملہ

دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب — تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے

کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری
میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے
فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہونگے

روز جزا جو قاتل دل جو خطاب تھا
میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا

پس شکستن خم زجر محتسب معقول
گناہ گار نے سمجھا گناہ گار مجھے

نقد جاں تھا نہ سزائے دیت عاشق حیف
خون فرہاد بسر گردن فرہاد رہا

کیوں غش ہوئے دیکھ آئینہ کو
کہتے تھے کہ تاب لائیں گے ہم

جراح کیا سوچا تا کیا رنگ دیکھا کیا ہوا
کیوں کھول لی پٹی مرے زخم جگر سے باندھ کر

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں
اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

دعا یا تھی شب غم سکون جاں کیلئے
سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کیلئے

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھیو
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا
میں الزام اُن کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

اب تو مرجانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو
ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جائے ہے

کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل
تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خواب ناز میں
ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

قتل دشمن کا ارادہ ہے اُسے
یہ سزا اپنی جاں نثاری کی

حیرت حسن سے یہ شکل بنی
کہ وہ آئینہ دکھاتے ہیں مجھے

نہ ربط اُس سے نہ یاری آسماں سے
جفا بہر عدو لاؤں کہاں سے

کس طرح مایوس ہوں تاثیر سے
دم رکے ہے نالۂ شب گیر سے

۳

مومن کی معاملہ بندی پر اگلا مضمون پڑھئے جس کا عنوان ہے "مومن کے کلام میں جرأت کا رنگ"۔ ان غزلوں میں بھی جن کے مطلعے درج ذیل ہیں۔ معاملہ بندی کے مضامین خوب ملتے ہیں۔

منظور نظر غیر سہی اب ہمیں کیا ہے
ہے دید تری آنکھ سے دل پہلے بھرا ہے

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

کیونکر نہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے
کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

۴

طنز و تعریض

سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں
کہ سخت چاہیئے دل اپنے رازداں کے لئے

شب ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے
زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

اب اور سے لو لگائیں گے ہم
جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کرینگے
وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کرینگے

سمجھ کے نادرست تری خو بگاڑ دی
ہم نے خراب آپ کیا اپنے کام کو

ہم حال کہے جائیں گے سنئے کہ نہ سنئے
اتنا ہی تو یاں حضرت ناصح کا اثر ہے

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

وہ بدخواہ مجھ سا تو میرا نہیں
عبث دوستی تم کو دشمن سے ہے

سرمگیں آنکھوں میں تم سرمہ لگاتے کیوں ہو
خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

ظرافت :- ۵۶

ہم حال کہے جائینگے سنئے کہ نہ سنئے
اتنا ہی تو یاں حضرت ناصح کا اثر ہے

توبہ گنہ عشق سے فرمائے ہے زاہد
یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شب فراق
ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

مے نہ اتری گلے سے جو اس بن
مجھ کو یاروں نے پارسا جانا

جو ملیں تجھ سے بصد شوق وہ کیا ہوں گے نہ کر
بس مرے سامنے حوروں کا بیاں اے واعظ

مجلس میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف
دیکھے ہے مجھ کو دیکھ کے اغیار کی طرف

مومن کو یہ ہے دولت دنیا و دیں نصیب
شب بتکدے میں گزرے ہے دن خانقاہ میں

پی ہے مے حضرت مومن نے جبھی مضمضہ کو
آفتاب کئی ہنگام وضو ہوتے ہیا

یہ کون کہے اس سے کہ ترک دعا میں نے
کر تو ہی ذرا ناصح پیغام بری اتنی

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہونگے

ثواب ترک صنم سچ سہی مگر مومن
یہ کیا سبب کہ سناتے ہو بار بار مجھے

کر چکا ہوں اس کا اخلاص بتاں میں امتحاں
میں نہ مانوں گا کہ مومن زاہد سالوس ہے

علمی اصطلاحات ۵۷

صبح دم آنے کو تھا وہ کہ گواہی دے دی
رجعت قہقری شمس و قمر آخر شب

کیوں نہ مجھ سے رم وہ ہوش اب زیادہ تر کرے
بدگماں ہے سبعۂ سیارہ کی تسخیر سے

علاج خواب راحت ہے علاج اس بدگمانی کا

وہ کافر گو رہیں مومن مرا شانہ ہلاتا ہے

ساتھ نہ چلنے کا بہانہ تو دیکھ — آ کے میری نعش پر وہ رو گیا

مومن حسد سے کرتے ہیں ساماں حجاب کا — ترسا صنم کو دیکھ کے نصرانیوں میں ہم

ہم بندگیٔ بت سے ہوتے نہ کبھی کافر

ہر جائے اگر مومن موجود خدا ہوتا

مومن کے کلام میں جرأت کا رنگ

یوں تو غزل میں میٹھی میٹھی باتیں کرنے کا مفہوم پہلے ہی سے شامل ہے لیکن یہی میٹھی جب لگاوٹ کی باتیں ہو جائیں تو اسے اصطلاح میں "معاملہ بندی" کہتے ہیں۔ معاملہ بندی سب سے پہلے فارسی غزل گو شاعروں میں ایجاد ہوئی۔ سلاطین صفویہ کے زمانہ میں جب تصوف کا مسلک ختم کر دیا گیا تو لامحالہ آسمانی محبوب کے بجائے ارضی محبوب سے دل بستگی بڑھ گئی اور پھر چونکہ معاملہ بندی کی باتیں عام پسند بلکہ عوام پسند بھی ہوتی ہیں اس لیے ایسے شعراء کو مشہور و مقبول ہونے کا موقع بھی خوب ملا۔ یوں تو سعدی، حافظ اور خسرو کے کلام میں بھی بہت سے اشعار اس انداز خاص کے نکل آئیں گے لیکن جس شخص نے متاخرین میں اس کو مستقل فن بنا لیا وہ مرزا اشرف قزوینی تھا۔ یہ وقوعہ گوئی کا مستقل موجد کہا جاتا ہے چنانچہ اس کی شہرت اور مقبولیت نے آنے والی نسل کو بھی اس طرف راغب کیا۔ وحشی یزدی علی قلی میلی اور علی نقی کمرہ اس کے خاص مقلدین میں سے تھے۔

ہندوستان میں معاملہ بندی کا مسلک عرفی اور نظیری نے رائج کیا۔

جوانی کی باتیں، طبیعتیں عاشقانہ، اُدھر جہانگیری رنگین مزاجی کیونکر معاملہ بندی رائج اور مقبول نہ ہو جاتی۔ خوب مقبول ہوئی اور یہی اثر شاہجہاں، عالمگیر اور شاہ عالم کے زمانہ سے گزرتا ہوا بہادر شاہ ظفر کے زمانہ میں نشو و نما ہوا لیکن یہ اثر اُن لوگوں میں مروج اور مقبول تھا جو فارسی سے ذوق رکھتے تھے یہ سچ ہے کہ بیدل اور ظہوری کی تعقید نگاری نے بھی ان لوگوں پر بہت کافی اثر کیا تھا۔ لیکن معاملہ بندی کے مزے رندی پسند طبیعتوں کو بھولے نہیں تھے۔ ذوق اپنی زبان کی سلاست، روزمرہ اور محاوروں کے پھیر میں پڑے رہیں۔ ظفر اپنی آپ بیتی رندیا کریں، شیفتہ اپنے زہد و تقویٰ کی تسبیح گھمایا کریں لیکن غالب اور مومن وہی کہیں گے جس میں یقین رکھتے ہیں یعنے رند و شراب و شاہد و ساقی مومن ایک رند مشرب شخص تھے مدتوں عشق کی گلیاں چھان چکے تھے کیسے ممکن تھا کہ اس طرف مائل نہ ہوتے۔ پھر بھی ان کا زمانہ عریاں معاملہ بندی برتنے کا نہ تھا ایک تو یوں ہی دہلی صوفیانہ خیالات کا مرکز تھا اور وہاں کی گلی کوچوں میں درد کے اشعار اور حافظ و سعدی کی غزلیں گونج رہی تھیں۔ محفلوں میں گائی جاتی تھیں۔ ماحول بھی عالمانہ اور بہت کچھ صوفیانہ تھا۔ ظفر کا صوفی مشرب ہونا، آشفتہ کا سخت پارسا ہونا۔ غالب کا صوفی صافی ہونا اور پھر اس کے ساتھ مولانا فضل حق، صدرالدین آزردہ وغیرہ کی بلند قسم کی دینداری مقلدین اور غیر مقلدین کی بحث، غرض زمانہ ایسا تھا کہ بالکل عریاں تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ہاں پھر بھی اگر جوانی نہ مانتی، طبیعت نہ رکتی تو غالب کی طرح شراب پی کر جو کچھ جی میں آتا زبان پر لایا جا سکتا تھا یا پھر مومن کی

طرح ثقاہت کے سانچے میں ڈھالا جا سکتا تھا تاکہ اپنی جوانی کا رنگ بھی آجائے اور ماحول کی علمی سنجیدگی وظاہری تقدس بھی برقرار رہے یہی وجہ ہے کہ ہم کو اس دور میں صرف دو ہی معاملہ بند شاعر ملتے ہیں مومن اور غالب۔

عموماً سطحی جذبات کا اظہار کا ارادہ کرنا اور پھر بھی دامن بچائے رکھنا بڑی تربیت دماغی کا کام ہوا کرتا ہے کیونکہ ایک تو زمین ہی ایسی پھسلنے والی ہوتی ہے کہ قدم جمے نہیں رہ سکتے۔ دوسرے یہ بھی خیال کہ شاعری باقی رہے اور آپ جانتے ہیں کہ جب باتیں بالکل صاف صاف کہدی جائیں تو پھر تصور کے لیے کچھ نہیں رہ جاتا۔ اور تصور کے لیے کچھ نہ رہ جائے تو شعر میں لطافت باقی نہیں رہتی ایک تو تغزل کا موضوع اس پر معاملہ بندی کی باتیں، پھر بھی ماحول کا تقاضا دیکھئے اور ذوق کی سلامت روی کہ مومن کس قدر نظریں چرائے اور دامن بچائے گزر جاتے ہیں یعنی اگر کوئی بات صاف بھی کہتے ہیں تو اس پر اس قدر پردے ڈال دیتے ہیں کہ پردہ نشین کا عکس تو نظر آجائے، پردہ نشیں نظر نہ آئے۔ قیس ناقہ کے گرد طواف کرتا رہے محمل کا پردہ نہ اٹھائے۔

صفیر بلگرامی اپنے تذکرہ جلوۂ خضر میں لکھتے ہیں کہ جرأت اس رنگ (معاملہ بندی) کے موجد تھے۔ مگر بہ سبب کم علمی کے بہت کھل گیے تھے۔ مومن خاں کے علم نے ان واقعات کو مشکل بندشوں اور نرالی ترکیبوں سے ایسے پردے میں رکھا کہ اداشناس ہی اس کے مزے جانتا ہے۔"

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

شب غم الفت ہمیں کیا کیا مزے دکھلائے تھا　　دم رکے تھا سینہ میں کمبخت جی گھبرائے تھا

یا تو دم دیتا تھا وہ یا نامہ بر بہکائے تھا — تھے غلط پیغام سارے کون یاں تک آئے تھا
کوئی دن تو اس پہ اک تصویر کا عالم رہا — ہر کوئی حیرت کا پتلا دیکھ کر بن جائے تھا
ناز شوخی دیکھنا وقت تظلم دمبدم — مجھ سے وہ عذر جفا کرتا تھا اور شرمائے تھا
ہو گئی دو روز کی الفت میں کیا حالت ابھی — مومن وحشی کو دیکھا اس طرف سے جائے تھا

رات کس کس طرح کہا نہ رہا — نہ رہا پر وہ مہ لقا نہ رہا
دل لگانے کے تو اٹھائے مزے — جی بلا سے رہا رہا نہ رہا

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا — میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

تارے آنکھیں جھپک رہے تھے — تھا بام پہ کون جلوہ گر رات ؟
اس گھر میں ہے عیش خلد مومن — کیا جانئے کہاں ہے دن کدھر رات

ہر چند اضطراب میں میں نے کمی نہ کی — تو بھی نہ واں تغافل بسیار کم ہوا

ہر ایک سے اس بزم میں شب پوچھتے تھے نام
تھا لطف جو کوئی مرا ہم نام نکلتا

وصل کی شب شام سے میں سو گیا — جاگنا ہجراں کا بلا ہو گیا

مت پوچھ کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم　　بس کیا کہوں میں کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں　　سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

چین جبیں کو دیکھ کے دل بستہ تر ہوا　　کیسی کشودِ کار کشادِ نقاب میں

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے　　منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

بے وفائی کا عدو کی ہے گلہ　　لطف میں بھی وہ ستاتے ہیں مجھے

گلہ ہرزہ گردی کا بے جا نہ تھا　　وہ کیوں مسکرائے بجا کہتے کہتے

حقیقت یہ ہے کہ اردو میں معاملہ بندی فارسی شاعری سے آئی۔ مومن اور غالب، عرفی، و نظیری کے خوشہ چیں ہیں لیکن اردو ادب میں معاملہ بندی ایک اور وجہ سے بھی پیدا ہوئی وہ یہ کہ جب سوسائٹی یا ماحول یا بادشاہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ جس کی صبح جام سے گزرے اور شب دلآرام سے تو لامحالہ تمام طبائع پر عیش پسندی اور سرور و انبساط کا رنگ چڑھ جاتا ہے آئے دن رنگ رلیاں ہوا کرتی ہیں۔ ہر روز عید ہوتی ہے ہر شب شب برات، ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ شاعری اور پھر اس میں معاملہ بندی کا عنصر کس قدر ترقی پذیر نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہان اودھ کا زمانہ جو دولت کی فراوانی کے باعث بے انتہا رنگ رلیوں کا زمانہ تھا۔ اور نت نئے ڈھنگ عیش پرستی کے ڈھونڈے جاتے تھے۔ شاعری کے حق میں بہت رنگین زمانہ سمجھا جاتا ہے یہاں دلی کی قنوطیت اور تصوف کی بلندیاں نہیں ہیں۔ یہاں میر کے سے لوگوں کی قدر نہ ہوگی، یہاں جوش ہے وہ مسکراتی اور بھاتی ہے۔ یہاں جو چیز ہے وہ زمین پہ ہے آسمان پر نہیں، وہ چیز بری ہو یا اچھی' یہ اور بات ہے۔ لیکن زاہدانِ خشک اور عالمانِ فقہ

دوسری گنجائش نہیں۔ مصحفی کے قسم کے لوگوں کی یہاں پگڑی اچھال دی جائے گی یہاں جو کوئی آئے ہنستا ہوا، ہنساتا ہوا۔ انشا کی طرح چٹکلے اور لطیفے سناتا ہوا۔ کسی کو گدگداتا، کسی کو منھ چڑاتا۔ غرض لکھنؤ کے عہدِ شاہانِ اودھ کی فضا ایسی تھی کہ لوگ خواہ مخواہ عیش پسند اور کاہل اور شعرا عموماً معاملہ بند اور ریختی گو ہو گئے۔ مستی کے بعد خیر بدمستی آتی ہی ہے اس لیے ریختی گوئی کے ذکر کو تو یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے کیونکہ ہر چیز حد سے زیادہ بڑھ کر بری ہو جاتی ہے لیکن معاملہ بندی پسندِ طبع عام ہو گئی اور خواہ اُسے میر صاحب چوماچاٹی کہہ کر سر نہ ہلائیں اور ایسی غزلوں پر داد نہ دیں لیکن اس کو کیا کریں کہ مشاعرے میں چھینٹیں پھر بھی اڑ ہی جاتی ہیں۔

معاملہ بندی کے خیالات دو وجہوں سے پیدا ہوتے ہیں ایک تو خود طبعی رجحان کی وجہ سے دوسرے ماحول کے اثر سے مومن کی معاملہ بندی کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ باوجودیکہ اُن کا ماحول اس قسم کے تعیش خیالی کا حامل نہ تھا پھر بھی مومن اپنے ذاتی رجحان کی وجہ سے اِس رنگ سے باز نہ رہ سکے یہ صحیح ہے کہ ماحول کا اور ان کی ماحول کے مطابق تعلیم و تربیت کا اتنا اثر ان کی طبیعت پر ضرور رہا کہ وہ کھل کر نہ کہہ سکے جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے، لیلیٰ معنی ستر پردوں میں پنہاں ہی رہی۔ برخلاف اس کے جرأت اگر کم علم نہ بھی ہوتے تو اُن کا ماحول انھیں عریاں کر دینے پر مائل ضرور کر دیتا۔ جب انشا جیسا عالم فاضل شخص باوجود اپنے تبحرِ علمی کے تردامنی سے باز نہ رہ سکا تو پھر میاں جرأت کی کیا حقیقت تھی۔ چنانچہ جرأت بھی وہ آرزو جو ہر دل میں ہوتی ہے

زبان پر صاف صاف لائے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ امر کہ اُن کے ماحول نے اُن کی اس بات کو سراہا اور داد دی، ماحول کے رجحان کی طرف اشارہ کرتا ہے یہ صحیح ہے کہ جرأت کم علم تھے اس لئے اچھی طرح کھل گئے۔ لیکن اگر وہ کم علم نہ بھی ہوتے تب بھی حالات اور واقعات ایسے تھے کہ بڑے بڑے علماء اور فضلا اس حمام میں آکر ننگے ہونے پر مائل نظر آتے تھے۔

برخلاف اس کے مومن اس قدر عریاں نہ ہو سکتے تھے۔ اس کے کئی وجوہ ہیں ایک تو خود ان کا علمی تبحر جس نے ان کی شوخی اور جوانی پر ثقاہت اور سنجیدگی کے پردے ڈال دئے تھے۔ اور جس نے ان کے معیار سخن اور قوت نقد کو بلند کر دیا تھا دوسرے یہ کہ ان کا ماحول ایسا نہ تھا کہ جرأت کی سی صاف اور کھلی قسم کی معاملہ بندی کو سراہ سکتا۔ بادشاہ صوفی منش، منکسر مزاج، رعایا غریب، تباہیوں پر تباہیاں اٹھائے ہوئے مفلوک الحال، جو کوئی کھاتا پیتا تھا اپنے حال کو غنیمت سمجھے ہوئے گوشہ گیر ہو چکا تھا۔ سودا کا خراب زمانہ اب خراب تر ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے ایسے دمشق میں عشق اور اس کی رنگ رلیوں کو کون یاد رکھ سکتا تھا۔ قوم کی جب حالت تباہ ہو جاتی ہے تو یاس، حزن اور تصوف کے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں یہی عالم مومن کے زمانہ کی دلّی کا تھا۔ ایک طرف شیفتہ، ذوق اور ظفر جیسے سنجیدہ قسم کے شعراء تھے۔ دوسری طرف علماء۔ مومن باوجود اپنی رندی طبع اور مقبولیت کے اپنے علم و فضل کا بھرم رکھنے کی خاطر کیونکر کھُل کر رنگ رلیاں منا سکتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنی مثنویوں میں کافی کھلے ہیں لیکن وہ اس لیے کہ مثنویوں میں نقادانِ فن ایسی صفائی کی اجازت دے چکے تھے قدیم مستند فاضل شعراء کی

مثنویوں میں، اس رنگ میں داد سخن دی جا چکی تھی — رہی غزل، اس میں اتنی آزادی نہیں تھی، اس لئے جرأت باوجودیکہ اساتذہ میں سے تھے اپنی رنگین اور پرشباب خصوصیت کی وجہ سے اس عالمانہ دور میں نمونہ نہیں بن سکتے تھے تیسری وجہ مومن کی ثقاہت اور سنجیدگی کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کا پیشہ ایسا تھا کہ اگر وہ جولانیوں پر آجاتے تو لامحالہ اُن کے طبابت کے سے سنجیدہ پیشے پر اثر پڑتا، اور وہ وقار اور اثر جو ایسے لوگوں کا قائم ہو جاتا ہے اور قائم ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اُن کے اس لاابالی طریقہ اظہار کے قطعی منافی ہوتا اسی لیے انھوں نے اپنی معاملہ بندی کا یہ معیار بنا لیا تھا۔

ہیں پاک نظر ہم تو، دلے ذوق فزا عشق
بے چاشنیٔ بوسہ و دشنام نہ ہوگا

یہ کہنا کہ عشق "پردہ نشیں" کی وجہ سے انھوں نے یہ طرز اختیار کیا۔ "اے پردہ نشیں ہم تجھے رسوا نہ کریں گے" ہو سکتا ہے کہ یوں بھی ہو، لیکن نہ تو ان کے عشق کا حال معلوم ہے اور نہ اُن کے پردہ نشیں کا راز۔ آخری بات یہ ہو کہ جو کچھ مومن نے جوانی میں کیا تھا اسے بُرا سمجھتے تھے اس لیے سنبھل گئے تھے۔ جرأت برخلاف مومن کے ایک تو علم و فضل بھی کچھ یونہی واجبی سا رکھتے تھے دوسرے ماحول کی رنگ رلیاں تیسرا پیشہ شاعری اور امراء کی مصاحبت، چوتھے رندی اور ہوسناکی در عہد شباب ادائی میں یقین اور اعتقاد رکھنے والے تھے ان سب وجوہ نے معیار اخلاق اور معیار شعر کمتر درجہ پر رکھا لیکن اُنھیں اس کے بلند کرنے کی کیا ضرورت تھی، جب ان کا ماحول، ان کا زمانہ، اُن کی جرأت رندانہ پر حرف گیر ہوتا تو در کنار الٹا سراہتا۔ تعریف کرتا اور مشاعروں میں چھیتیں اڑا دیتا تھا۔ حریف، ظریف، خوش طبع، عاشق مزاج آدمی تھے

ان کی طبیعت بجائے محنت پسند ہونے کے عشرت پسند تھی۔ تعجب یہ کہ زمانے نے خکر خورے کو شکر دے کہ تمام عمر فقد ردان اور نادر بردار امیروں میں بسر کردی" دوسری جگہ آزاد پھر لکھتے ہیں کہ میاں جرأت کی خوش مزاجی، لطیفہ گوئی، مسخراپن حد سے گزری ہوئی تھی، اور ہندوستان کے امیروں کو نہ اس سے زیادہ ضروری کوئی کام، نہ اس سے زیادہ کوئی نعمت تھی۔ آج ایک امیر کے ہاں ہیں دوسرے امیر آئے سوار کیا اور ساتھ لے گئے چار پانچ دن وہاں رہے، کوئی اور نواب آئے وہاں سے وہ لے گئے" جب ایسے شخص کی افتاد مزاج اور گزران ایسی ہو تو اس کی خودی اور خودداری اور معیار اخلاق و معیار سخن معلوم، دونوں کے معیار سخن اور معیار طبع کی چند مثالیں دونوں کا فرق نمایاں کر دیں گی:۔

جرأت

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں
ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں
کیا رُک کے وہ کہے ہے جو ٹک اس سے لگ چلوں
بس بس پرے ہو شوق یہ اپنے تئیں نہیں
فرصت جو پا کے کہئے کبھو دردِ دل تو ہائے
وہ بدگماں کہے ہے کہ ہم کو یقیں نہیں
اس بن جہان کچھ نظر آتا ہے اور ہی
گویا وہ آسمان نہیں وہ زمیں نہیں
کیا جانے کیا وہ اس میں ہے لوٹے ہے جس پہ دل

یوں اور کیا جہان میں کوئی حسیں نہیں
ہر چند ہے بہ لطفِ شبِ ماہ سیرِ باغ
اندھیر پر یہی ہے کہ وہ مہ جبیں نہیں
سنتا ہے کون کس سے کہوں دردِ بیکسی
ہمدم نہیں ہے کوئی مرا ہم نشیں نہیں
حیرت ہے مجھ کو کیونکہ وہ جراءت ہے چین سے
جس بن قرار جی کو ہمارے کہیں نہیں

مومن

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی وعدہ یعنی نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی بیٹھے سب ہیں جو روبرو تو اشارتوں ہی سے گفتگو
وہ بیان شوخی کا برملا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم
گلۂ ملامتِ اقربا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمھارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنؔ مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جرأتؔ

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا
چمپئی رنگ اسکا اور جوبن وہ گدرایا ہوا

بات ہی اوّل تو وہ کرتا نہیں مجھ سے کبھی
اور بولے بھی ہے کچھ منھ سے تو شرمایا ہوا

جا کے پھر آؤں نہ جاؤں اس گلی میں دوڑ دوڑ
پر کروں کیا میں نہیں پھرتا ہی دل آیا ہوا

بے سبب جو مجھ سے ہی وہ شعلہ خو سرگرم جنگ
میں تو ہوں حیراں کہ یہ کس کا ہی بھڑکایا ہوا

جاؤں جاؤں کیا لگایا ہی اجی بیٹھے رہو
ہوں میں اپنی زیست سے آگے ہی اکتایا ہوا

ہے قلق سے دل کی یہ حالت مری اب تو کہیں
چار سو پھرتا ہوں اپنے گھر میں گھبرایا ہوا

حکم بارِ مجلس اب جرأت کو بھی ہو جائے جی
یہ بچارہ کب سے دروازہ پہ ہے آیا ہوا

مومنؔ

توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے
وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کرینگے

ٹھہری ہی کہ ٹھہرائیں گے زنجیر سے دل کو
پھر بر ہمی زلف کا شکوا نہ کرینگے

اندیشۂ امژگاں میں اگر خوں نے کیا جوش
نشتر سے علاجِ دل دیوانہ کرینگے

گر آرزوئے وصل نے بیمار کیا تو
پرہیز کریں گے پہ مداوا نہ کرینگے

تشبیہ ز لبس دیتے ہیں بہلائے بتاں کو
مر جائیں گے پر منت عیسیٰ نہ کرینگے

پھر جائے نہ وہ چشم صنم آنکھ کے آگے | سیر چمن نرگس شہلا نہ کرینگے
رکھ لیویں گے پتھر مگر ان سنگدلوں کو | چھاتی سے لگانے کی تمنا نہ کرینگے
گو دار پہ کھنچیں ہمیں دلدار نصاری | پر آرزوے زلف چلیپا نہ کرینگے
گر حسن گلوسوز نے پھر آگ لگادی | کیوں آب دم تیغ سے ٹھنڈا نہ کرینگے
ہے عہد کہ پھر جا نہ پھریں کوئے بتاں میں | پھر جائیں اب اس عہد سے ایسا نہ کرینگے
جوں قبلہ نما گرچہ تڑپتے ہی کٹے عمر | پر منہ سوئے دیر صنم آرا نہ کرینگے
اے حضرت مومن یہ مسلم جو ہے ارشاد | بھولے سے بھی اب ذکر بتوں کا نہ کرینگے
لیکن جو بتوں ہی نے بھلا آپ سے کی بات | پھر آپ ہی فرمائیں کہ کیا کیا نہ کرینگے

جرأت

امشب کسی کاکل کی حکایات ہے واللہ | کیا رات ہے کیا رات ہے کیا رات ہے واللہ
دل چھین لیا اس نے دکھا دست حنائی | کیا ہات ہے کیا ہات ہے کیا ہات ہے واللہ
عالم ہے جوانی کا جو ابھرا ہوا سینہ | کیا گات ہے کیا گات ہے کیا گات ہے واللہ
دشنام کا پایا جو مزا اس کے لبوں سے | صلوات ہے صلوات ہے صلوات ہے واللہ
جرأت کی غزل جس نے سنی اس نے کہا واہ | کیا بات ہے کیا بات ہے کیا بات ہے واللہ

مومن

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح | اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح
نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں | کمبخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح
لگتی ہیں گالیاں بھی ترے منہ سے کیا بھلی | قربان تیرے پھر مجھے کہہ لے اسی طرح
نے جائے واں بنے ہے نہ بن جائے چین ہے | کیا کیجیے ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح

معشوق اور بھی بتا ہے جہان میں　　کرتا ہے ظلم کون کسی پہ تری طرح
ہوں جاں بلب بتانِ ستمگر کے ہاتھ سے　　کیا سب جہاں میں جیتے ہیں مومن اسی طرح

جرأت

اس ڈھب سے کیا کیجے ملاقات کہیں اور　　دن کو تو ہم سے رہو رات کہیں اور
کیا بات کوئی اس بت عیار کی سمجھے　　بولے ہے جو ہم سے تو اشارات کہیں اور
اس ابر میں پاؤں میں کہاں دخترِ رز کو　　رہتی ہے مدام اب تو وہ بد ذات کہیں اور
جس رنگ مری چشم سے برسے ہے پڑا خوں　　اس رنگ کی دیکھی نہیں برسات کہیں اور
گھر اس کو بلا نذر کیا دل تو وہ جرأت　　بولا کہ یہ بس کیجے مدارات کہیں اور

مومن

ہے نگاہ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے　　یہ ستم اے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے
سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آجائے ہے　　تھامتا ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے
حسن روز افزوں پہ سبزہ کس لئے اے ماہرو　　یونہی گھٹتا جائے گا جتنا کہ بڑھتا جائے ہے
تاب طاقت صبر راحت جان و ایمان عقل و ہوش　　ہائے کیا کہیے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے
رو رہا ہوں خندہ دنداں نما کی یاد میں　　آب گوہر کیلئے آنکھوں سے دریا جائے ہے
دیکھیے انجام کیا ہو مومن صورت پرست　　شیخ صنعاں کی طرح سوئے کلیسا جائے ہے

یہ عام رنگ ہر دو شاعروں کا ہے لیکن یہ بھی نہیں کہا سکتا کہ مومن ہمیشہ سنجیدہ ہی رہتے تھے وہ بھی جب کھلنے پر آتے تھے تو کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے. حالانکہ یہ انکا عام رنگ نہیں ہے، طبیعتاً اکثر مجبور ہو جاتے ہیں مثلاً :-

دست جنوں نے میرا گریباں سمجھ لیا　　الجھا ہے اُن سے شوخ کے بند قبا کے ساتھ

یارب وصالِ یار میں کیونکر ہو زندگی نکلی ہی جان جاتی ہے ہر بار اک ساتھ

کہا میں نے بات وہ کوٹھے کی مرے دل سے صاف اتر گئی
تو کہا کہ جانے میری بلا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ بگڑنا وصل کی رات کا، وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی گھر میں تو پہنچا میں ترے، پر کیا کروں
دم نکل جاتا تھا کھٹکے سے برابر رات کو

یاد دلوائی تپش نے تیری شوخی وصل کی
مر گئے ہم دیکھ کر چیں ہائے بستر رات کو

وہ ہے بغل میں تو بھی تو یاں نیند اڑ گئی
یہ سوچ ہے گیا نہ ہو اعدا کے خواب میں

آن بیٹھا کون کوٹھے پر جو یوں حیراں ہیں ہم
خاک پر چپکے پڑے تکتے ہیں سوئے بام ہم

نیند میں یارب دوپٹہ کس کے منہ سے ہٹ گیا
ہے زمیں سے روشنی افلاک پر نور افشاں تلک

وہ تو بغل میں غیر کے سینے سے لگ کے، یاں
پہلو برائے زخم ہے، سینہ برائے داغ

شوقِ وصال دیکھ کے آیا عدو کے گھر سوجھا نہ کچھ مجھے شبِ مہتاب دیکھ کر
لگی ہچکی ہی سر زانوئے غم پر ہے کہ یاد آیا کسی کا ہاتھ ہر دم مارنا زانو پہ وقتِ قسم کر

اے سوزشِ سینہ مجھے وہ سینہ دکھا دے
کھولے تری گرمی سے وہ گھبرا کے اگر بند

ہلائے رہے چھیڑ، رات سُن سُن کے
حال میرا کہا کہ کیا صاحب!؟

وحشت سے میری سارے اَحبّا چلے گئے
آنا ہی گر تو آؤ کہ خالی مکان ہے اب

کشادِ دل پہ باندھی ہے کمر آج
نہیں خیر آپ کے بندِ قبا کی

کیا جب التفات اُس نے ذرا سا
پڑی ہم کو حصولِ مدعا کی

ہیں پاک نظر ہم تو دلے ذوقِ فزا عشق
بے چاشنیِ بوسہ و دشنام نہ ہوگا

غیروں سے اس نے چھیڑ کی گو نہ ہاتھا پائی
جب تک اجل کا صدمہ دو چار تک نہ پہنچا

اتنا تو نہ گھبراؤ، راحت یہی فرماؤ
گھر میں مرے رہ جاؤ آج آئے ہو کل جانا

یارانِ نو کے واسطے مجھ سے خفا ہوئے
تم کو نہیں ہے پاس نیازِ قدیم کا

غیر کو سینہ کیسے ہے یہ مہر دکھلا دیا
تم نے کیا کچھ کس کو اتنی بات پہ دکھلا دیا

وعدہ وصلت سے ہو دل شاد کیا
تم سے دشمن کی مبارک باد کیا

کوئی بھینچے ہے دل کو پہلو میں
کس نے کی اُس سے ہمکناری آج

پھرتے ہیں سو سو وسوسے جی میں، دل میں سودے آتے ہیں
کوٹھے پہ وہ دھوپ میں اپنے بال کھڑے سکھلاتے ہیں

شام سے اپنے سو رہے وہ تو، اور ہم ان کے کوچہ میں
ولولہ ہائے شوق سے کیا کیا پھرتے ہیں گھبراتے ہیں

کرتے ہیں آواز زنیری، دیتے ہیں دستک سو سو بار
گھر میں پتھر پھینکتے ہیں، زنجیرِ در کھڑکاتے ہیں!

اب اغیار سے ہاتھا پائی ہے کیوں
نزاکت بس اے نازنیں ہو چکی!

وہ کہاں ساتھ سلاتے ہیں مجھے — خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے

کب ہمارے ساتھ سوتے ہیں کہ دیکھے گا کوئی — ان کو بیتابی ہے کیوں اس خواب بے تعبیر سے

ارمان نکلنے دے بس اے بیم نزاکت — ہاں ہاتھ تصور میں مرا زیب کمر ہے

اس ستم کیش نے یہ اپنے نصیبوں کا لکھا — خط بھی لکھا تو سلام اس میں رقیبوں کا لکھا

معاملہ بندی اور پھر سلامت روی، عالی دماغی اور بلند ہمتی کا کام ہے ہر کس و ناکس سے ممکن نہیں، یہاں نظیری، عرفی اور غالب جیسے حضرات ہی اس سے عہدہ بر آ ہو سکتے ہیں۔

نظیری

تا منفعل ز رنجش بیجا نہ بینمش — می آرم اعتراف گناہِ نکردہ را

عرفی

در دلِ ما غم دنیا غم معشوق بود — بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

غالب

کبھی نیکی گر اس کے جی میں کچھ آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

جرأت کا معیار عامیانہ ہے ان کے کلام میں اور چھچھورپن میں صرف چند ہی قدم کا فاصلہ رہ جاتا ہے ممکن ہے ان کا کلام نوجوان اور بوالہوسوں کے دل کو بھاتا رہے لیکن اہل مذاق اور ارباب ذوق و نظر ہمیشہ ان کے مقابلے میں مومن کا کلام پسند کرتے رہیں گے مگر ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جو روانی، گھلاوٹ اور قدرتِ بیان جرأت کے وہاں ملتی ہے اس کے

اس کے سامنے مومن گویا ناپختہ معلوم ہوتے ہیں جرأت کے اشعار ڈھلے ہوئے ہیں برخلاف اس کے مومن کے گھڑے ہوئے۔ جرأت کی استادی اور قدرتِ کلام مومن کے مقابلہ میں ہمیشہ مسلم رہے گی جس کو خود مومن بھی مانتے تھے اور جب اُن سے کہا جاتا تھا کہ حضرت آپ کے کلام میں جرأت کا رنگ آتا جارہا ہے تو مسکرا دیتے تھے۔

غالب کی قدر

ماضی، حال اور مستقبل میں

شکایت کسی کو کب پیدا ہوتی ہے؟ اُس وقت جب آدمی کسی بات کی امید رکھے اور وہ پوری نہ ہو سکے۔ مرزا نے اپنے زمانہ کی ناقدری کی شکایت کی ہے اور بیشتر جگہ

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہے کھائیں گے کیا؟

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

مرزا ایک سپاہی پیشہ آدمی تھے، گھر اور ننہال دونوں خوش حال طبیعت

کی موزونی سے شاعری اختیار کی، لیکن وہ عزم و ہمت اور حوصلہ مندی جو سپاہی زادوں
اور زور آزماؤں میں ہوا کرتی ہے اسے کہاں رکھ آتے چنانچہ ان کی طبیعت ان
کے ساتھ آئی، موزونی طبع زوروں پر تھی، عزم و ہمت نے راستہ بتایا کہ تم اس
راہ پر چلکر یکتائے روزگار ہوگے اور اس قدر بلند جیسے فردوسی و انوری اور اس قدر
تمہاری قدردانی ہوگی جیسی محمود، جہانگیر اور خانخاناں کیا کرتے تھے، دولت
شہرت اور عزت حوصلہ مند کو اور کیا چاہیے۔ چنانچہ غالب نہایت جوش و خروش
اور امیدوں کے ساتھ اس میدان میں آگئے مگر تھوڑے ہی دنوں میں انھیں سرد
آہیں بھرنا پڑیں اور اپنی قسمت اور زمانہ کی ناقدری کی شکایت کرنا پڑی۔ کیوں؟ سبب
ایک تو وہ زمانہ ہی بدل گیا تھا، نہ اکبر تھا نہ جہانگیر اور نہ ان درباروں
کے سے امراء، فیضی، یا ابوالفضل، عرفی یا نظیری بھی اس زمانہ میں ہوتے تو اپنی
بے بسی، بیچارگی اور بیقدری کا غالب ہی کی طرح رونا روتے۔ کیا اکبر شاہ ثانی اور
کیا ظفر دونوں محض شاہِ شطرنج تھے ان کی عملداری صرف قلعہ تک محدود تھی بادشاہ
نام کے تھے، انگریزوں سے وظیفہ پاتے تھے اور اسی میں زندگی بسر کرتے تھے۔ امراء
الگ مفلوک الحال جس کے پاس کچھ تھا بھی وہ اسی کو دانتوں سے پکڑ کے گوشہ نشین ہو گیا
تھا۔ سرکار انگریزی کو شاعری اور مداحی سے دلچسپی نہ تھی۔ اور نہ وہ آئندہ شہرت
کے لالچ میں شاعروں کو منہ لگاتی تھی۔ غرض کہ شاعروں کی قدر کون کرتا، نفسی نفسی
پڑی ہوئی تھی اپنا ہی پورا نہ ہوتا تھا تو دوسرے کا کون پورا کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غالب
جنھوں نے بڑی امیدوں سے یہ پیشہ اختیار کیا تھا سخت مایوس اور ناکام ہوئے۔
دوسری وجہ یہ تھی کہ خود مرزا کے لئے زندگی اتنی آسان اور بازیچۂ اطفال

ثابت نہ ہوئی جتنی ان کے شاعرانہ دماغ نے شاید سمجھ رکھی تھی۔ پانچ برس کے تھے کہ باپ کا انتقال ہوا۔ نو برس کے ہوئے تو چچا سدھارے۔ سسرال کے ناز و نعم، پھر اس کے بعد جائداد کے جھگڑے۔ قرض کا مقدمہ۔ چیسر والا واقعہ۔ غدر کی تکالیف۔ بھائی کی موت، غرض کہ اس برے طور سے قسمت ان کو الٹی پلٹی رہی کہ ان کے رونے کو آنکھ میں آنسو بھی نہ رہے اس لئے اگر انھوں نے مقدر، قسمت یا خدا کا گلہ کیا تو بیجا نہ تھا۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

اور غالباً یہی سبب تھا کہ ان کے دماغ نے فلسفیانہ طور پر اس کا رد پیدا کیا اور اس طرح ان کی روح کو تسکین دی۔ ورنہ "جز وہم نہیں ہستی اشیا میرے آگے" کا مفہوم معلوم!

اور غالباً یہی وجہ تھی کہ زود حسی اور بھی زیادہ زود حس ہو گئی اور انھیں ہر طرف غم کے سیاہ سیاہ بادل ہی نظر آنے لگے۔

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

ہفت آسماں بگردش و ما درمیان او
غالب دگر مپرس کہ برما چہ می رود

ہے سبزہ زار ہر در و دیوار غمکدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اسکی خزاں نہ پوچھ

اور وہ اب اگر کوئی امید بھی کرتے ہیں تو ڈر ڈر کے اور سہم سہم کے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

نامرادم دارد ایں افزونی خواہش بہ دہر
آب بر من بستہ انگاری ز استسقائے من

ہر گونہ حسرتے کہ ز ایام می کشم ۔۔۔ دُردِ تہ پیالۂ امید بودہ است

نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانہ میں ۔۔۔ حریف رازِ محبت مگر در و دیوار

غرضکہ روئے اور خوب خوب روئے اور جی بھر کے زمانے اور اپنے زمانے والوں کی بے حسی اور بے قدری کا گلہ کیا گئے۔ چنانچہ اکثر ان کے خطوط میں بھی یہ چشمہ پھوٹ بہا ہے۔

ایک اور وجہ ان کی شکایت کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اُن کے کہنے کا طریقہ دوسرا اور لوگوں کا سمجھنے کا طریقہ دوسرا، سخن پیمائی کا رنگ الگ، سخن فہمی کا ڈھنگ جدا اسی لئے غالب نے شاعری شروع کی تو ایک طوفان تھا کہ ان کے خلاف کھڑا ہو گیا۔

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال

پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

والا معاملہ۔ یا پھر کھلے مشاعروں میں اُن پر چوٹیں۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے ۔۔۔ مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

زبانِ میر سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے ۔۔۔ مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

یا پھر آزردہ کے مکان پر فارسی مشاعرہ والا واقعہ

تو ایکہ محو سخن گستران پیشینی ۔۔۔!

مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

غرضکہ ایک تو شاعر یونہی زود حس ہوتا ہے اُس پر یہ دل آزار تنقیدیں، شروع ہی میں دل بجھ گیا، ان کے لئے وہ بہت مبارک دن ہوتا کہ جب کبھی ان کی تعریف ہو جاتی یا کوئی ان کے کلام کی صحیح معنوں میں تعریف کرنے والا مل جاتا ۔۔۔

یہی وجہ تھی کہ انھیں اُن دنوں منھ بسور کر کہنا پڑتا تھا

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　سُن سُن کے اسے سخنوران کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

یا

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

مختصر یہ کہ زمانہ الگ بُرا لگا ہوا۔ زندگی کی تکالیف اور مصیبتیں الگ طبیعت میں زود حسی الگ بڑھی ہوئی اور پھر اس پر قدردانوں کی یہ قدردانی۔ مرزا کے لیے سوائے اس کے اور کیا رہا تھا کہ اپنے نقادوں اور اپنے زمانے کا گلہ کرتے ہوئے اپنے فن پر شہید ہو جاتے۔ (جیسا کیٹس نے کیا تھا) یا پھر اپنا طرز عمل بدل دیتے جیسا کہ آخر کار مرزا نے کیا اور جیسا کہ ہم لوگ کہتے ہیں کہ مرزا نے ٹھیک ہی کیا اور یہی چیز مرزا کے لیے بقائے دوام کا باعث ہوئی۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا واقعی مرزا اپنی ناقدری پر اسی قدر نالاں تھے۔ جیسا کہ یادگار میں حالی نے درج کیا ہے۔ اور اگر تھے تو کیا وہ اپنی اس شکایت میں حق بجانب تھے؟ یہ بات کہ نالاں تھے، اوپر کے داخلی و خارجی شواہد سے عیاں ہو گئی لیکن یہ کہنا کہ اس میں وہ حق بجانب تھے صحیح نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ بات ذہن سے نکال دی جائے کہ حرص کی کوئی حد نہیں ہے یا ایک شاعر کبھی مطمئن نہیں ہوتا تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب کی ان کے زمانے نے اتنی قدر کی جتنی کہ وہ کر سکتا تھا۔ غالب خود مطمئن نہ ہوں یہ اور بات ہے لیکن ان کے

عہد نے ان کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ خصوصاً ان کی آخر عمر میں جب تیس سال سے کچھ اوپر ہی کے تھے تو صاحب گلشن بے خار نے ان کی اتنی تعریف کر دی کہ گارساں دتاسی متعجب ہو گیا کہ شیفتہ اور پھر اس قدر تعریف کرے۔ دلّی کے متعلق ایک کتاب آثار الصنادید لکھی جاتی ہے اس میں جس غلو کے ساتھ ان کی مدح کی گئی ہے اس پر بھی یہ ناقدری کی شکایت کرتے ہیں۔ دلّی کو چھوڑیے دلّی کے باہر ان کے ماننے والے دوسرے بہت سے لوگ ہیں جن میں سے اکثر سے تو خط و کتابت ہے۔ اکثر اُن سے خاص کر ملنے آتے ہیں۔ غلام غوث بے خبر نساخ، ناسخ، آنے والوں میں عزیز لکھنوی، صفیر بلگرامی اور سید غوث علیشاہ قلندر، اس کے علاوہ مراعات بھی دوستوں کی طرف سے ہوتی رہتی ہیں۔ غدر میں ان کو آسودہ ان کے ہندو دوستوں ہی نے رکھا! قید فرنگ میں ہر طرح کا آرام پہنچانے والا شیفتہ ان کا دوست ہی تھا۔ انگریزی مدرسے کے لئے فارسی کے لیکچرر کی ضرورت ہے ان کا نام دلّی کے بہترین فارسی دانوں میں لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مومن، آزردہ، شیفتہ، مولوی فضل حق و دیگر عمائد وا کابر شہر ان کے ماننے اور جاننے والوں میں ہیں۔ آخر میں ذوق سے بھی میل ہو گیا۔ بادشاہِ وقت ان کا شاگرد ہے، دلّی میں انھیں اور کیا چاہیے۔ باہر سے قاضی القضا مولوی ولایت حسین، نواب میر غلام بابا خاں سورت سے ان کا کلام منگا کر دیکھتے ہیں۔ اور انھیں تحفہ و تحائف بھیجتے رہتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نواب رامپور شاگرد ہو جاتے ہیں اور سو روپے ماہوار مقرر کر دینے کے علاوہ اکثر ان کا قرضہ بھی ادا کر دیا کرتے ہیں اور ان کی پنشن اور خلعت

کے لیے کوشش کرتے ہیں، مہاراجے اور راجہ رئیس الگ ان پر نظر شفقت رکھتے ہیں، بادشاہان اودھ کے وہاں بھی ان کا شہرہ کافی ہے اور جب انھوں نے قصائد بھیجے تب وہاں سے انعام ملا۔ (یہ اور بات کہ ان تک نہ پہنچا) آخر میں وہاں سے پانچ سو سالانہ بھی مقرر ہو جاتے ہیں، خود بہادر شاہ ظفر حالانکہ ابھی ان کے شاگرد نہیں ہوئے ہیں لیکن ان کی رہائی کے لئے حکومت انگریزی میں سفارش کرتے ہیں۔ سرکار انگریزی کی طرف سے ان کو خان صاحب بسیار مہربان دوستان لکھا جاتا ہے پنشن اور خلعت دربار میں اس کے علاوہ۔ اب بھی اگر کوئی اپنے مقدر کی شکایت کرے تو ع

"ایسے شکوہ کو تو بس شکوہ بے جا کہیے"

ان کے خطوط چھپتے ہیں۔ اور ان کی مانگ خصوصاً پنجاب میں اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ ان کو بار بار اپنے دوستوں کو لکھنا پڑتا ہے کہ جلدی اور چھپوا دیئے جائیں۔ ہندوستان کے کیا اعلیٰ اور ادنیٰ سب لوگ اس طرح ان کو مانتے ہیں مگر ان کی روح خوش نہیں ہوتی اور وہ خوش نہ ہوں گے جب تک کہ انھیں ملکہ وکٹوریہ اپنا درباری خاص شاعر نہ بنالیں اور اگر غدر کی وجہ سے ان کی یہ اسکیم ناکام ہو جائے تو یہ شخص ہر ایک کی مدح و ستائش اور قدر دانی کو ناکافی سمجھکر خود اپنی تعریف کرنے پر اتر آئے گا گویا زمانہ بھی اس قدر تعریف کرے اور ان کے کلام کو اتنا مانے جتنا کہ یہ سمجھتے ہیں تب ان کی پیاس بجھ سکے گی۔

گر شعر و سخن بدہر آئیں بودے دیوانِ مرا شہرت پرویں بودے
غالب اگر ایں فنِ سخن دیں بودے آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

اور اپنی اس قدر افزائی کے لیے کیا کیا کوششیں نہیں کرتے اور کیا کیا جوڑ توڑ نہیں لگاتے۔ تقریباً ہر ریزیڈنٹ اور گورنر جنرل کی تعریف میں قصیدے لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ گورنر جنرل کے پرائیویٹ سکریٹری یا کسی عہدہ دار سے دوستی ہو جاتی ہے تو اسکی مدح کرنے میں بند نہیں رہتے۔ بادشاہ بہادر شاہ ظفرؔ کے یہاں جوڑ توڑ لگا کر پہنچ جاتے ہیں۔ رامپور کے یہاں الگ سکہ جا لیتے ہیں۔ بادشاہ اودھ کے یہاں الگ زور لگاتے ہیں۔ حیدرآباد دکن الگ قصیدے بھیجتے ہیں لیکن وہاں سے کوئی جواب نہ ملنے پر خاموش رہ جاتے ہیں لیکن ان تمام ہند کے نوابوں اور بادشاہوں پر ان کی حوصلہ مندی مطلئن اور مجبور ہو جانا پسند نہیں کرتی یعنی جب تک یہ ملکہ وکٹوریہ کے خاص شاعر مقرر نہ ہو جائیں انھیں چین نہیں آسکتا، غرض کہ مرزا نے ہر ممکن طریقے سے کوشش کی کہ وہ اپنے زمانے سے بہترین قدر لے لیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کے زمانہ نے ان کی کافی قدر کی جتنی کر سکتا تھا۔ اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی لیکن اس کو کیا جائے، اگر پھر بھی کوئی یہی کہتا رہے کہ

"بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے"

اب یہ دیکھنا ہے کہ کیا وہ اس قدر طلب شہرت و عزت میں حق بجانب تھے، جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے مرزا نے فن شاعری میں کوئی نیا راستہ نہیں نکالا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے فقط اپنے طبعی جوہر سے پرانی روش میں جان ڈال دی تھی اور اپنے کمال شاعری سے غزل کو انتہائی عروج تک پہنچا دیا تھا۔ لیکن اس کامیابی پر انھیں اپنے معترضین کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

نہ کہ ان کا شکوہ سنج کیونکہ یہ انھیں حضرات کی بدولت تھا۔ کہ مرزا صحیح راستہ پر پڑ گئے اور فن شعر میں اس قدر مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔ اس بات کو خود مرزا نے بھی آخر مان لیا ہے چنانچہ ان کا منتخب اردو دیوان چھپتا ہے تو اس میں لکھتے ہیں: "منتخب دیوان سے باہر جو میرے اشعار ملیں انھیں میرا نہ سمجھا جائے۔"

بخلاف اس کے جہاں تک انکی فارسی شاعری کا تعلق ہے خود ان کے معاصرین ان کو نہیں مانتے تھے۔ وہ اپنے کو عرفی سے بڑھ کر سمجھتے رہیں ؏

عرفی کسے است لیک نہ چوں من دریں چہ بحث

یا تھوڑا بہت شیفتہ مان لیں کہ ان کے شاگرد تھے۔ لیکن صدرالدین آزردہ وغیرہ ان کو کبھی شعرائے عجم کے برابر نہ مانیں گے رہی مرزا کی خود کی غلط فہمی تو باوجودیکہ اُن کی مے قحط خریداری سے کہن ہو گئی پھر بھی ابھی تک کسی نے اس کی اتنی تعریف و توصیف نہیں کی جتنی کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہو گی۔ بلکہ اردو جس کو اپنے لیے ننگ سمجھتے تھے اُن کے لئے باعث عزت بن گئی۔ اور اصل یہ ہے کہ ان کا حقیقی رنگ انھیں اردو غزلوں میں نبھ سکا ہے نہ کہ ان کی فارسی میں — اگر مرزا کی اس غلط فہمی کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو بھی صاف ظاہر ہے کہ انسان کی جب کسی میدان میں قدر کم ہوتی ہے تو وہ ایسے میدان ڈھونڈھتا ہے جس کے مرد میدان کم یا معدودے چند ہوں تاکہ وہاں اُس کو اپنی بہتری اور برتری دکھانے کا موقع مل سکے۔ چنانچہ اسی قسم کا واقعہ مرزا کے ساتھ پیش آیا اُردو کا بازار ذوق کے ہاتھوں میں تھا۔ مشاعرے شاہ نصیر ذوق وغیرہ کے طرز سخن

سے گرم ہوتے رہتے تھے۔ ان کے طرز کی وہاں کہاں گنجائش۔ چنانچہ شروع شروع میں، انھوں نے اردو میں بے دلی کا رنگ اختیار کرکے جو رعب ساڈالنا چاہا تھا، نہ جما تو اُس طرف سے فرار ہو کے میدان فارسی میں آ گئے کہ اس کے جاننے والے بہت زیادہ نہ تھے اور اس لئے کہ فارسی ایک طرۂ امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ فارسی سے مناسبت ان کو بچپن سے تھی لیکن بالکل اردو چھوڑ کر فارسی کا اختیار کر لینا ضرور اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ ان کے اشعار پر بڑی تنقیدیں ہوتی تھیں۔ اور اس لیے یہ مکدر ہو کر فارسی کے میدان میں چلے گئے۔ اس کے علاوہ ان کی پر پیچ طرز ادا کا اظہار متاخرین شعرائے فارسی کے انداز ہی میں ہو سکتا تھا۔

لیکن موجودہ زمانہ نے جس قدر ان کی قدر کی اس سے اگر مرزا زندہ ہوتے تو ان کے آنسو ضرور پنچھ جاتے، کسی شاعر یا شخص کی قدر اس لئے ہوتی ہے اور اُسی وقت ہوتی ہے جب زمانہ اس کے خیال کے مطابق چلنے اور سوچنے لگے۔ مرزا کے خود زمانہ کا معیار لفظی صنعت گری اور ظاہری روایات شاعری کا برتنا تھا خیالات کی وہاں نہ کوئی قدر تھی نہ کوئی جگہ، خیالات کا دائرہ محدود اور مقرر تھا اور اعجب شاعری کو محض اُسی دائرے میں جولانی دکھانا منظور۔ جن اشعار کی تعریف ہوتی وہ ایسے ہوتے جن میں یا تو قافیے اور ردیف کی سخت دقتیں ہوں یا پھر ان میں کوئی رعائت لفظی ہو یا کسی قسم کی حسن تعلیل یا کوئی اور تمثیل یا ثبوت یا پھر کوئی لفظی یا معنوی صنعت، لیکن مرزا کی خوش قسمتی (حالانکہ بعد از مرگ) کہ زمانہ کا معیار شعری بہت جلد بدل گیا انگریزوں کی آمد آمد نے تصورات کے قلعوں کو ڈھایا، غلو اور مبالغہ کی سر بفلک دیواریں مسمار ہو گئیں اور لوگوں کے تخیل نے واقعات اور موجودات سے زیادہ

قریب رہنا شروع کر دیا محض ظاہری صورت ایک بے کار معنی سی چیز ہو گئی۔ خیالات
محسوسات و جذبات اصل شے قرار دیے گئے۔ تخیل بغیر صداقت کے ناکافی
سمجھا گیا۔ چنانچہ مرزا کی شاعری کا ستارہ چمکا۔ اور اس طرح وہ مے کہنہ آخر رنگ
لائی۔ مختصر یہ کہ بجائے لفظی صنعت گری کے معنوی ندرت خیال کی طرف زمانہ کا
رجحان ہونے لگا۔ آورد شعریت کے لیے بدمذاقی قرار دی گئی۔ اور محض قوافی و ردیف
کا نظم کر دینا ہی شاعری نہ سمجھا گیا۔ آمد شعریت کا جزو اعظم قرار دی گئی۔ مدح اور مدحیہ
قصائد کا ستارہ گردش میں آ گیا، کیونکہ وہ ایک چیز تھی تمام تر آورد۔ خیالات و جذبات
لازمۂ شاعری قرار دیئے گئے اس میں کچھ تو مغربی طرز تہذیب، دوسرے کچھ انگریزی ادب
کا اثر تھا جس نے یہ کایا پلٹ کر دی۔ لوگ جو واقعات پسند تھے ان کی طرف دوڑے
اصلی اور حقیقی محاکات کا اثر زیادہ ہونے لگا بہ نسبت خیالی محاکات کے۔ جذبات
محسوسات کی دنیا گرم ہوئی، فرضی خیالات افسانے ہو چلے قدرتی مناظر اور ان
کی رنگینی نے دامن پکڑنا شروع کیا۔ شاعری اب محض ایک پیشہ یا ہنر نہیں رہ گئی بلکہ
ایک ذوقی اور وجدانی چیز جس پر ہنر صرف جلا کرتا ہے۔ اب شاعری شاگردی یا
ذریعہ استادی نہیں رہی بلکہ ذاتی چیز، ایک ذاتی عطیۂ فطرت۔

اس ذوق شاعری اور معیار شاعری کے بدل جانے کے علاوہ کچھ خیالات
اور اعتقادات بھی ایسے بدلے کہ تقریباً وہی ہو گئے جو مرزا کے تھے۔ اظہار خیال
میں طرح طرح کی جدتیں، نئے نئے اسلوب، طرفگی ادا، تقدیر و مذہب کا مضحکہ
جنت و دوزخ پر ہنسنا، آزادی افکار، تقلید سے کوسوں دور بھاگنا، اعلیٰ معیار
کی ظرافت، اسی زندگی کو اصلی اور مکمل زندگی ماننا، عشق مجازی یعنی معاملہ بندی

کی اعلیٰ مثالیں، زندگی کا ایک فلسفیانہ نظریہ، حیات بعد الممات اور عبرت وغیرہ مضامین سے پرہیز، مادی دنیا سے بمقابلہ روحانی دنیا کے زیادہ الفت۔ غرضیکہ تمام تر جو اعتقادات مرزا کے تھے کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ انگریزی تعلیم کے اثر سے تقریباً اسی قسم کے مثلی خیالات رونما ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ انیسویں صدی کا کروٹ بدلنا تھا کہ مرزا کی قدر و منزلت میں جو اضافہ ہونا شروع ہوا اس نے آخری تان یہاں آکر توڑی کہ "ہندوستان کا ویدوں کے بعد دوسرا الہامی کلام" ان کا دیوان ہو گیا۔ اور اس طرح سے آخرش مرزا کی پیشین گوئی تو پوری ہو گئی۔ کہ میرے کلام کی شہرت میرے بعد ہو گی: ؎

شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

مرزا کا زمانہ خود ایسا زمانہ تھا۔ جو کروٹ لے رہا تھا۔ پرانے ٹمٹماتے چراغ باقی تھے اسی میں مرزا بھی پیدا ہو گئے تھے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطرت نے مرزا کو کوئی سو سال پیشتر پیدا کر دیا تھا ظاہر ہے کہ مرزا کے زمانہ والے مرزا کو سمجھ نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ نہ سمجھے۔ وہ جدید طرز کے آدمی تھے آزاد روش، تقلید سے نفرت" زلہ بردار کس چرا باشم۔ من ہمایم مگس چرا باشم" میں یقین رکھنے والے، خودی اور خودداری کو سراہنے والے، وہ بھلا خاکسار این زمانۂ ظفر شاہی کے ساتھ کیونکر بسر کر سکتے:

دوسری وجہ یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ مرزا کے کلام میں جو کچھ ہے اسے واقعہ اور واقعیت سے بہت تعلق ہے۔ محض خیالی طوطا مینا نہیں بنایا گیا ہے محض سنی سنائی باتوں کا بیان نہیں ہے بلکہ قلب غالب کے مشاہدات کا آئینہ ہے اس رباب پر دست قدرت نے ایک ایک کر کے سارے سُر بجائے ہیں: اور

دیوان غالب انھیں سُروں کی صدائے بازگشت ہے ؎

زخمہ بر تارِ رگِ جاں میزنم
کس چہ داند تاچہ دستاں میزنم

اور یہی وجہ ہے کہ چونکہ دل سے نکلی ہوئی لے تھی دلوں پر اثر کرکے چھوڑا۔

کلام غالب کی مقبولیت کی تیسری اور سب سے بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ غالب نے کسی خاص خیال، کسی خاص جذبے کا اظہار اپنا مقصد نہیں بنا لیا۔ اگر یہ صورت ہوتی تو وہ صرف اُسی حلقہ میں مقبول ہو سکتے جو اُس خاص خیال یا نظریہ میں اعتقاد رکھتا۔ مثال کے طور پر میر صرف قنوطیت کے بادشاہ ہیں، لامحالہ اُن اشخاص کو ان سے زیادہ الفت ہوگی جن کی فطرت اور طبیعت میں قنوطیت کو زیادہ دخل ہوگا لیکن مرزا بحیثیت ایک شاعر اعظم کے فطرت انسانی کے ہر جذبہ سے اسی قدر متاثر ہوئے جتنا کہ حد سے زیادہ حساس آدمی اُس سے ہو سکتا تھا یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہر جذبہ کا اظہار نہایت شدت کے ساتھ بلند معیار پر کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر قسم کی طبیعت کا آدمی ان کے کلام سے دلچسپی لیتا ہے۔ کسی کو ان کے دیوان میں فلسفۂ تفاؤل نظر آتا ہے تو کسی کو ان کا فلسفۂ غم بھاتا ہے، کوئی سمجھتا ہے کہ غالب کا نظریہ زندگی کے متعلق بس یہی تھا کہ "دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا وچہ دیں" اور "اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے"۔ کوئی ان کو متشکک سمجھتا ہے کہ جیسے خودی بے سبب نہیں غالب، کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔" غرضکہ جو جس افتاد مزاج کا آدمی ہے اسے ویسی ہی تصویر دیوان غالب میں نظر آتی ہے۔

گویا ایک آئینہ ہے جس میں خود دیکھنے والے کو اپنی شکل نظر آجاتی ہے، اور یہ خصوصیت در اصل ایک شاعر کی عظمت پر دلالت کرتی ہے اس قدر حیرت انگیز تنوع صرف دنیا کے بڑے بڑے شاعروں ہی میں مل سکتا ہے ان کے اشعار کے پیچھے ہمیں ایک ایسی پُر معنی شخصیت چھپی ہوئی ملتی ہے جس کے جاننے کے لیے ہم بیقرار رہتے ہیں۔ بقول بجنوری "لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں، کونسا نغمہ ہے جو اس ساز کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں"

غالبؔ کی مقبولیت کی بہت کچھ ذمہ دار "یادگار غالب" بھی ہے اس سے پیشتر اگر غالبؔ مقبول بھی تھے تو ایک محدود حلقے میں اور اس محدود حلقے کے بھی خواص میں۔ نہ کہ عام طور پر۔ یادگار نے اس کمی کو بڑی حد تک دور کر دیا عموماً مشکل چیزوں کی قدر اُن کی تشریح سے ہوتی ہے دیوان غالب اور خود غالبؔ کی قدر حالیؔ کے پُر اعتقاد قلم نے عوام میں بے حد و حساب بڑھادی۔ کچھ تو ان کے اشعار کی تشریح، کچھ خود ان کے متعلق حالات جنھوں نے غالبؔ کو ایک اعلیٰ آدمی کی صورت میں پیش کیا۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں کہ اثر کئے بغیر نہ رہ سکیں زمانہ موافق تھا۔ حالیؔ کی آگ نے بغیر جلائے نہ چھوڑا۔ چنانچہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ان کے دیوان کی شرحیں، ان کے کلام کے مختلف اڈیشن، ان کے کلام پر تنقیدیں، ان کی زندگی کے حالات، ان کے مکتوبات، رسائل میں ان پر بے انتہا مضامین بے حد تحقیق تدقیق اور کاوش سے لکھے جانے لگے۔ آج بھی جس قدر شرحیں، اڈیشن، اور تنقیدی مضامین غالب پر ملیں گے اتنے کسی اور

اُردو کے شاعر پڑھ سکیں گے، چند نام مندرجہ ذیل ہیں۔

شرحیں:۔ شرح کلام غالب (آسی) شرح دیوان غالب (قاضی سعید احمد) بیخود دہلوی، نظامی بدایونی، سہا، طباطبائی، مولانا حسرت موہانی، گنجینۂ تحقیق (بیخود موہانی) وغیرہ۔

اڈیشن:۔ نول کشور اڈیشن۔ نسخۂ حمیدیہ۔ جرمنی اڈیشن۔ طاہر اڈیشن مصور نقش چغتائی اڈیشن۔ مصور مرقع چغتائی اڈیشن، معمولی لائبریری اڈیشن۔ ترجمہ بزبان جرمنی وغیرہ۔

سوانح عمریاں:۔ یادگار غالب (حالی) غالب (غلام رسول مہر) غالب نامہ (اکرام) ذکر غالب (مالک رام) نکات غالب (خود نوشت از مکاتیب وغیرہ)۔

تبصرہ جات:۔ محاسن کلام غالب (بجنوری) غالب (عبد اللطیف) غالب کی شاعری (مرزا محمد عسکری) روح کلام غالب (مرزا عزیز بیگ)۔ غالب (عارف ہسوی) لطائف غالب وغیرہ۔

رسائل میں تبصرے ان کے علاوہ ہیں غرضکہ جس قدر تنقیدی مواد غالب پر موجود ہے اتنا ابھی تک کسی دوسرے اردو شاعر پر نہ مل سکے گا۔ تعلیم کے رواج نے پڑھنے والے اور تشریحوں نے غالب کے سمجھنے والے بہت پیدا کر دیئے۔ اور وہی غالب جو کبھی صرف قلعہ معلّٰی کے اکابر کی تفریح طبع کیلئے مخصوص تھا۔ آج گھر گھر

---

[1] یہ مضمون ۱۹۳۹ء میں لکھا گیا تھا اُس وقت اقبال پہ اتنی کتابیں نہیں لکھی گئی تھیں جتنی اب ملتی ہیں (ن)

ہر ایک کو خوش کرتا نظر آئے گا۔ اگر پہلے ذوق کی غزلیں ارباب نشاط گاتے تھے اور غالب کو کوئی پوچھتا نہ تھا۔ تو آج مشتاق گویے، گرامفون ریکارڈ، فلمی گانے اور ریڈیو پر ہر طرف صرف غالب کی غزلیں کہی اور گائی جاتی ہوئی ملیں گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ کلام غالب نہ صرف خواص ہی بلکہ عوام میں بھی اب کافی مقبول ہو گیا ہے غرضکہ غالب کی قدر و منزلت موجودہ دور میں درجہ کمال پر پہنچی ہوئی ہے اور وہ غرابت جو بیدل کے رنگ کی وجہ سے نامانوس تھی اب حل ہو کر مقبول خلائق ہو گئی ہے۔

لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ باقی رہے گی. کیا صدیاں گزر جانے پر بھی غالب اتنا ہی اور اسی قدر مقبول اور منظور نظر رہے گا۔ اگر ماضی کا حال ہم نہ دیکھ چکے ہوتے تو ممکن تھا ہمارا ذوقِ اعتقاد یہ کہنے پر مائل کر دیتا کہ شاید ہی کوئی ایسا زمانہ آسکے جس میں غالب مقبول نہ ہو لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہاں ایسا زمانہ بھی گزرا ہے، اور پھر آسکتا ہے جب غالب کا ساشاعر بھی غیر مقبول اور غیر معروف رہے۔ لہذا یہ صحیح کہ زمانہ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اور تغیر زمانہ کے آب و گل میں ہے، اب بھی بہت سے پرانے حضرات ایسے باقی ہیں جنھیں غالب کے اشعار میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی اور وہ ناسخ کے کلام پر سر دھنتے ہیں لہذا کیا یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ کلام غالب ہمیشہ ہمیشہ اسی شد و مد کے ساتھ قائم رہے گا یا اس کی موجودہ قدر و منزلت قائم رہے گی، اور اگر قائم رہے گی تو کس حد تک؟

اگر زمانہ اپنی گردش نہیں کرتا اور لوگ پھر ایک دم جاہل نہیں ہو جاتے

نف. غالب پر فلم بھی بن گیا ہے (ن)

یا پھر یوں کہنے نہیں لگ جاتے کہ کس طرح کہا ہے بجائے اس کے کہ کیا کہا ہے۔ حالانکہ ادب میں "کس طرح" کو اتنی ہی اہمیت ہے جتنی "کیا" کو ہے لیکن کسی ایک نقطۂ نظر کو حقیقت سے کوسوں دور نہیں ڈالا جا سکتا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ دیکھنے کے لیے کہ اشعار غالب اتنے ہی مقبول رہیں گے کہ نہیں ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ غالب نے کیا کہا، اور کس طرح کہا ہے؟ آیا جو کچھ کہا ہے وہ باقی رہنے والی چیز ہے یا فنا ہو جانے والی۔ آیا جس طرح کہا ہے کیا وہ چیز اُس سے بہتر طریقے پر بھی کہی جا سکتی ہے یا کہی جا سکے گی؟ ان سوالات کا جواب دینا کوئی آسان بات نہیں۔ پھر بھی اتنا کہا جا سکتا ہے کہ جب تک انسان کے پہلو میں دل ہے اور دل میں محبت تب تک مشکل ہے کہ ذیل کے اشعار اس کے دلی جذبات کی ترجمانی کر کے اسے لطف و تسکین نہ دے سکیں۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نیند اُس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منھ پر رونق!
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کے تم مرے لیے ہوتے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد ردالی غزل

کس منہ سے شکر کیجئے اِس لطف خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

یا جب تک دماغ میں سوچنے کی اور دل میں راز حقیقت کے سمجھنے کی کاوش موجود ہے (یا جب تک کوئی باخبر آ کر ان سب رازوں کو آشکارا نہیں کر دیتا) اس وقت تک ناممکن ہے کہ غالب کے ذیل کے اشعار ہر مفکر کے دماغ میں کبھی نہ کبھی جگہ نہ پا لیں۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفیِ منصور نہیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس رنگ میں جو آئے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

چلتا ہوں تھوڑی دیر ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے۔ نہیں ہے!

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں　　ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خودبیں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یا جب تک انسان کے خمیر میں ظرافت اور شوخی کا مادہ موجود ہے اور ایسی باتوں سے اس کے دل میں گدگدی پیدا کی جاسکتی ہے اُس وقت تک غالب کے یہ اشعار اُس کو مسکرا دینے پر ضرور مجبور کر دیں گے۔

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منھ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بُو آئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

وعدہ آنے کا وفا کیجیے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے اپنے گھر کی دربانی مجھے

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد　　آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

یا جب تک غم کو انسان سے اور انسان کو غم سے تعلق ہے اس وقت تک غالب کے مندرجہ ذیل اشعار کبھی نہ کبھی زبان سے نکلے بغیر نہ رہیں گے۔

قیدِ حیات بند و غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

ہے سبزہ زار ہر در و دیوار غمکدہ جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالب کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

یا جب تک انسان دوسروں کے تجربوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اسوقت تک غالب کے عمر بھر کے یہ تجربے کبھی نہ بھلائے جا سکیں گے!

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا　　جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب　　خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیے

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

یا جب تک انسان میں کبھی کبھی لاابالی پن، رندی اور آزادہ روی کے خیالات موجزن ہو کر اُسے دنیا و مافیہا سے بلند کر سکتے ہیں اُس وقت تک یہ رنگینیاں فراموش نہ ہو سکیں گی۔

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو　　اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے
پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے　　پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

یا جب تک تشبیہ و استعارات میں اثر ہے اور بات شیشہ و ساغر کے بغیر نہیں بنتی، یا جب تک طرز ادا کی ندرت دلوں کو بھا سکتی ہے اُس وقت تک ذیل کے اشعار کیونکر فراموش ہو سکیں گے۔

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا — بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے — اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید — ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

نظر لگے نہ کہیں اسکے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے — دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا — جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک — میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

یا جب تک ثقیل الفاظ بلا اختلال معنی اور رواں افتاں وخیزاں بحریں، آواز کی ترتیل سے موسیقیت پیدا کر سکتی ہیں اس وقت تک ارباب نشاط ذیل کی غزل کو سے

محفل رچانا کیونکر چھوڑ سکیں گے۔

درد منت کشِ دوا نہ ہوا ! — میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو

نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

رہیئے اب ایسی جگہ چلکر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی

نکتہ چیں ہے غمِ دل اسکو سنائے نہ بنے — کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

یہ امر کہ مندرجہ بالا اشعار باقی رہیں گے اِس بات سے ثابت ہے کہ ابھی سے وہ لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گئے ہیں اور جو اشعار ضرب المثل کی طرح رواج پاگئے ان کو گویا بقائے دوام حاصل ہوگئی، نہ صرف اُن کے اشعار بلکہ اکثر اُن کی تراکیب کو بھی جو انھوں نے خود اپنی قوتِ اختراع سے ایجاد کی تھیں مثلاً فردوس گوش، جنت نگاہ وغیرہ۔ رہی یہ بات کہ انھیں باتوں کو کوئی ان سے بہتر کہہ سکتا ہے یا نہیں یا غالب اس طرز کے خاتم ہوگئے اِس کا کوئی

جواب نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے غالب کی بقائے دوام کے لئے صرف دو رکاوٹیں رہ گئیں، ایک تو موجودہ رجحان اور پروپگنڈا جو غزل کے خلاف ہو رہا ہے دوسرا زبان کا مسئلہ۔ اول الذکر تو خیر ایسا نہیں کہ کامیاب ہوسکے اس لئے کہ غزل میں اس کی خاص سہولتیں اور خصوصیتیں ہیں۔ ان کی بنا پر اسکی ہردلعزیزی کبھی کم نہ ہوگی، رہا زبان کا سوال تو یہ واقعی اہم مسئلہ ہے اور اس کے متعلق کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ ممکن ہے کہ آئندہ ہندوستان کی زبان ایسی نہ رہے جس میں فارسی اضافتیں یا عطف یا الفاظ اس قدر شدت و کثرت سے ہوں جیسی کہ دیوان غالب میں ہیں۔ اس لیے ہم بالکل یقین کیساتھ تو نہیں کہہ سکتے کہ غالب ہمیشہ ہمیشہ اسی شدومد اور زور و شور کے ساتھ مقبول رہیں گے، ہاں اتنا البتہ کہا جاسکتا ہے کہ جب تک اُردو زبان اور اس کے سمجھنے والے قائم ہیں (اور جب تک غزل گوئی میں ان سے بڑھ کر کوئی شاعر پیدا نہیں ہوتا) غالب شاعر غالب رہیں گے ورنہ ایسے ان کی تاریخی حیثیت تو خیر بالکل مسلم ہے، غالب کی شاعری کا اردو نظم میں درجہ اور ان کا اثر دوسروں پر یہ چند ایسی حقیقتیں ہیں کہ غالب کو تاریخ ادب میں اعلیٰ جگہ دیے بغیر نہیں رہ سکتیں مناسب فارسی الفاظ کو فارسی تراکیب میں جڑنا، الفاظ کے مراتب پہچاننا، استعاروں اور تشبیہوں میں حسن اور معنی پیدا کرنا اختصار اور بلاغت سے زور کلام بہم پہنچانا سادگی میں پرکاری سمونا، فطرت انسانی کے رازوں کو بے تکان اور بڑی لاپرواہی سے آشکارا کرنا یہ سب باتیں آنے والے شاعروں پر ضرور اپنا اثر کرتی رہیں گی۔ چنانچہ زمانہ موجودہ میں بھی اقبال، فانی، عزیز اور ثاقب کے کلام میں کچھ

فرق کے ساتھ اسی رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے اور آئندہ بھی نہ جانے کتنے، یہ اسی طرح کے معنوی شاگرد پیدا کرے۔ مذاق سخن کا لفظی صنائع اور ظاہری خوبیوں کی طرف سے معنوی خوبیوں اور خیال بندیوں کی طرف دھارا پھیر دینا اس اجتہاد میں غالب کی حیثیت الگ مسلم ہے ایک اور امر جس کی وجہ سے ممکن ہے ان کی شہرت آئندہ مزید بڑھے وہ رموز فطرت انسانی ہیں جو ابھی حل نہیں ہوئے ہیں اور ممکن ہے علم نفسیات کی ترقی کے ساتھ آئندہ واضح ہوں۔ مثلاً

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے — یہ دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

(ہمایوں اکتوبر ۱۹۳۹ء)

اقبال کا نوجوان اور اُس کی تعلیم

پہلی جنگِ عظیم کے اختتام نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی طاقتوں اور اپنی اندرونی قوتوں کا دوبارہ جائزہ لیں اور دیکھیں کہ آیا کہ وہ اس قابل ہیں بھی کہ موجودہ طوفان خیز موجوں میں اپنی کشتی کسی سمت یا کسی طرح کامیابی سے چلا سکیں حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہ بڑا نازک وقت تھا (اور اب بھی ہے)۔ سلطنت ترکی جس پر مسلمانوں کو خاص طور پر اور بجا طور پر ناز تھا ٹکڑے ٹکڑے کر دی گئی تھی۔ ایران کی حالت الگ زبوں تھی اور وہ اپنی زندگی کے لیے روسی اور انگریزی قرضوں کا پابند تھا۔ عرب میں نا اتفاقی تھی، اور اس لیے بیشتر غیر اقوام کا شکار، کابل غریب تھا، ہندوستان غلام، چین بے بس، ایسی حالت میں یقیناً مسلمانوں کیلئے ظاہراً صرف یہی ایک صورت ہو سکتی تھی کہ ہر مسلمان ملک اپنے اپنے حدود میں محصور ہو کر اپنی بھلائی اور بہبودی کی ترکیبیں سوچنے لگے، لیکن ایک اس سے بھی بہتر صورت تھی وہ یہ کہ پہلے مسلمان خود غور کریں کہ وہ مذہبی، تعلیمی، معاشرتی اور تمدنی حیثیت سے دیگر اقوام کے مقابلے میں کیا درجہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ اسی

سوال کا حل اس وسیع دنیا کی زمینوں میں ان کی زندگی کے لیے جگہ مقرر کر سکے گا۔ اس وقت جو مسلمانوں کی حالت تھی وہ مختصراً یہ کہ توہم پرست، گذشتہ میں یقین رکھنے والے، تقدیر پر پڑے رہنے والے، تدبیر و محنت سے جی چرانے والے، علم و عمل کی دنیا سے دور بھاگنے والے۔ اسلام کی روح سے بے خبر۔ ظاہری باتوں اور فضول کی روایات پر ایمان رکھنے والے، نتیجہ یہ ہوا کہ زمانہ نے انھیں بہت جلد دکھا دیا کہ اب وہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لائق نہیں رہے۔ ان کی تلواریں اب زنگ آلود ہو گئیں تھیں۔ اتفاق ان سے اٹھ گیا تھا، ایمان ان سے جاتا رہا تھا ان کی تہذیب پرانی ہو گئی تھی، اس لیے بہتر یہی تھا کہ اب اس دنیا میں وہ کوئی اپنا حق نہ سمجھیں بلکہ ان لوگوں کے لیے جگہ چھوڑ دیں جو ان سے بہتر تھے، اور زندہ رہنے کے لیے ان سے محق تر۔ یہ حالت و کیفیت تھی جس میں مسلمانوں نے اپنے آپ کو پایا لیکن اصلاح کی کوشش کون کرتا۔ وہ جس کے دل میں درد ہوتا، یا وہ جس کے ہاتھ میں طاقت ہوتی طاقت مصطفےٰ کمال کے ہاتھ میں تھی اور درد اقبال کے دل میں۔

چنانچہ جب مسلمانوں کی اس پستی کی طرف نظر پڑی تو اقبال رو دیے بغیر نہ رہ سکے طاقت تو تھی نہیں کہ ایک دم زبردستی لوگوں کو صراط مستقیم پر لا ڈالتا۔ صرف درد تھا جس کی بدولت اس نے مسلمانوں کے زوال پر پیچ و تاب کھایا اور انھیں جوش دلایا کہ وہ اپنی اس گئی گزری ہوئی حالت کو سدھاریں، طرح طرح سے اکسایا کہ وہ قوت عمل اور جد و جہد کے اصول کو سمجھیں اس پر عمل کریں تاکہ ترقی کرکے دوسری اقوام کے دوش بدوش ہی نہ چلنے لگیں بلکہ ان سے گوئے سبقت لے جائیں۔ اور اس طرح ان کی گزری ہوئی حالت پھر سدھر جائے اور ان کا روشن گزشتہ عہد دوبارہ عود

کرتا ہے۔

علامہ "پیام مشرق" کے دیباچہ میں ایک جگہ رقمطراز ہیں "یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو تقریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے۔ اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور ان کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔ مشرق بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔۔۔ اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو قابل احترام ہے"۔ غرضکہ علامہ نے قرآن کریم کے اس سادہ اصول کو مانتے ہوئے کہ "لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم (کوئی قوم نہیں بدلتی جب تک اس کے افراد کے دلوں میں تغیر نہ ہو)۔ مسلمانوں کی ذہنیت جو عرصے سے پست ہو گئی تھی بدلنے کی کوشش کی لیکن یہاں صرف ہم ان کے اُس پیغام سے بحث کریں گے جو انھوں نے مسلمان نوجوانوں کو دیا۔

عرصے سے مسلمان نوجوانوں کی حالت کیا ہے نظر غور بتاتی ہے کہ سوائے تن آسانیوں کے ہم لوگوں کی اور کوئی غایت اور غرض نہیں ہوتی۔ لاپرواہیاں، مذہب سے ناآگہی، مذہب کے اصول سے بالکل بےخبری۔ مقصد حیات

محض ذاتی عظمت، فرنگی تعلیم اور مغربی فیشن سے محبت، خود اپنی حالت درست کرنے کی خواہش نہ رغبت

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی

ظاہر ہے کہ استغنا کیسے ہو جب دل میں نہ وسعت ہے نہ اطمینان اور اصلی جڑ تمام خرابیوں کی یہی دل کی بے سروسامانی ہے جس کی تعمیر کی اقبال کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ جب تک دل ٹھیک نہیں ہوتا خارجی معاملات بھی نادرست ہی رہیں گے۔ آپس میں نفاق، سزبی، غداری، نہ سجدوں میں تڑپ، نہ نگاہ میں ذوق، قومیت سے بے گانہ اس لیے فرد بھی منتشر اور قوم بھی تباہ۔ دوسروں کے آگے دریوزہ گری۔ اپنی غلامانہ حالت کو باعث وقار سمجھنا یہاں تک کہ خود احساس غلامی کا مٹ جاتا۔ نتیجہ یہ کہ ظاہر محض نمائش اور دل محض تاریک۔ جس قوم کے نوجوانوں کا یہ حال ہو اس قوم کی بقا معلوم۔ فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر۔

نوجوانان تشنہ لب، خالی ایاغ　　　شستہ رو، تاریک جاں، روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و نا امید　　　چشم شاں اندر جہاں چیزے ندید

ناکساں، منکر ز خود مومن بہ غیر خشت بند از خاکِ شاں معمار دیر

موجودہ تعلیم سے اقبال نالاں ہیں اور بجا طور پر کہ نہ صرف الحاد پیدا کرتی ہے بلکہ ہم کو بغیر کسی مقصد کے چھوڑ دیتی ہے۔ اس کی نہ کوئی منزل ہے نہ مقصود۔ یہ صحیح ہے کہ کہ دماغ کو روشن کرتی ہے لیکن دل کو مار دیتی ہے روح اور اس کی تمام اعلیٰ صفات کو بے کار کر دیتی ہے۔ نہ دل میں سوز رہتا ہے نہ روح میں تڑپ، ہم مادیت اور محض شکم میں یقین رکھنے لگتے ہیں۔ روح کی اعلیٰ خوبیاں ہماری نگاہ سے دور ہو جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم کو اپنے میں یقین نہیں رہتا اور جب اپنے میں یقین نہ رہا تو ظاہر ہے کہ دوسروں کے محتاج ہو گئے۔ حضرت اقبال مسلمان نوجوانوں کی اسی زار حالت کی شکایت پیغمبر صلعم سے یوں کرتے ہیں۔

این مسلماں زادۂ روشن دماغ ظلمت آبادِ ضمیرش بے چراغ
در جوانی نرم و نازک چوں حریر آرزو در سینۂ او زود میر
این غلام ابن غلام ابن غلام حریت اندیشۂ او را حرام
مکتب از دے جذبۂ دیں در ربود از وجودش ایں قدر دانم کہ بود
ایں ز خود بیگانہ ایں مست فرنگ نان جو می خواہد از دستِ فرنگ
ناں خرید ایں فاقہ کش با جان پاک داد مارا نالہ ہائے سوزناک
دانہ چیں مانندِ مرغانِ سرا است از فضائے نیلگوں نا آشنا ست

ایک دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں۔

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما — لیکے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ
تخم دیگر بکف آریم و بکاریم ز نو — کانچہ کشتیم ز خجلت نتواں کرد درو

عصرِ حاضر کی تعلیم پر یوں تبصرہ کرتے ہیں

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی — اس زمانہ کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر — چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

جب پیرِ فلک نے ورق ایام کا الٹا — آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
پائی نہ ملا زمزمِ ملت سے جو اس کو — پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

اقبال اس ناپختہ تعلیم اور اس سے اثر پذیری کی ذمہ داری محض نوجوانوں ہی کے سر نہیں تھوپ دیتے بلکہ اُن اساتذہ سے بھی نالاں ہیں جو خود نہ تعلیم کا مقصد سمجھتے ہیں نہ اس علم میں غائر نظر رکھتے ہیں جس کا وہ درس دیتے ہیں۔

شیخِ مکتب کم سواد و کم نظر — از مقامِ او نداد او را خبر
آتشِ افرنگیاں بگداختش — یعنی ایں دوزخ دگرگوں ساختش
مومن و از رمزِ مرگ آگاہ نیست — در دلش لا غالب الا اللہ نیست
تا دلِ او در میانِ سینہ مُرد — می نیندیشد مگر از خواب و خورد
از فرنگی می خرد لات و منات — مومن و اندیشۂ او سومنات
قم باذنی گوے و اُو را زندہ کن — در دلش اللہ ھو را زندہ کن
ما ہمہ افسونیٔ تہذیبِ غرب — کشتۂ افرنگیاں بے حرب و ضرب
تو ازاں قومے کہ جامِ او شکست — وانمایک بندۂ اللہ مست

تا مسلماں باز بیند خویش را
از جہانے برگزیند خویش را

ایک دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں۔

مکتب از مقصود خویش آگاہ نیست
تا بجذبِ اندرونش راہ نیست
نورِ فطرت را زِ جانہا پاک شست
یک گُل رعنا ز شاخ اُو نرست
خشت را معمار با کج می نہد
خوئے بط با بچۂ شاہیں دہد
جاوید نامہ

غرضکہ اس تعلیم نے جس نے مسلمان نوجوانوں کی دماغی ذہنیت اور روحانی فطرت کو یوں بدل دیا ہو اسے اقبال کس طرح پسند کر سکتے تھے۔

من آں علم و فراست با پرِ کاہی نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را

اسی لئے اقبال چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلم نوجوانوں کی ذہنیتوں میں انقلاب پیدا ہو جائے تاکہ ان نوجوانوں کو اپنی رفعت کی حد اپنی حیات کا مقصد اور اپنی روحانی طاقتوں کا احساس ہو سکے۔

اے مسلمانان فغاں از فتنہ ہائے علم و فن
اہرمن اندر جہاں ارزاں و یزداں دیریاب
انقلاب،
انقلاب اے انقلاب

واعظ اندر مسجد و فرزند او در مدرسہ
آں بہ پیری کودکے ایں پیر در عہد شباب
انقلاب،
انقلاب۔ اے انقلاب

لیکن وہ ایسا انقلاب محض ظاہری، نمائشی یا وقتی نہیں چاہتے بلکہ دل کا اور روح کا انقلاب چاہتے ہیں۔ اور یوں بھی انقلاب کی تلقین اُسی وقت صحیح ہو سکتی ہے جب ایک دوسرا لائحہ عمل پیش نظر ہو جائے۔ یہ دل و نظر کا انقلاب اقبال کے خیال میں صحیح مذہبی تعلیم میں پنہاں ہے کیونکہ اسی سے دل و نظر کی تعلیم یعنی اخلاق کی تعمیر ہو سکتی ہے موجودہ تعلیم گو بظاہر نہایت اعلیٰ سہی لیکن جب تک اس سے ذہنی و فکری بلندی نہ نصیب ہو اس وقت تک تعلیم کا مقصد حل نہیں ہو سکتا۔

مرید ہندی:- چشم بینا سے ہے جاری جوئے خوں
علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں

پیر رومی:- علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

مرید ہندی:- پڑھ لئے میں نے علوم شرق و غرب
روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

پیر رومی:- دست ہر نا اہل بیمارت کند
سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

مرید ہندی:- علم و حکمت کا ملے کیونکر سراغ
کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ

پیر رومی:- علم و حکمت زاید از نان حلال
عشق و رقت آید از نان حلال

مسلمان نوجوانوں اور ان کی تعلیم کا صحیح اندازہ کیا ہے۔

عقلہا بے باک و دلہا بے گداز — چشمہا بے شرم و غرق اندر مجاز
علم و فن دین و سیاست عقل و دل — زوج زوج اندر طوافِ آب و گل
آسیا آں مرز و بوم آفتاب — غیر بیں از خویشتن اندر حجاب
قلب او بے وارداتِ نو بنو — حاصلش را کس نگیرد با دو جو
روزگارش اندریں دیرینہ دیر — ساکن و یخ بستہ و بے ذوق سیر
صید ملایاں و نخچیر ملوک — آہوئے اندیشۂ او لنگ و لوک
عقل و دیں و دانش و ناموس و ننگ — بستۂ فتراک لردانِ فرنگ

یا دوسری جگہ

در مسلمانان مجو آں ذوق و شوق — آں یقین آں رنگ و بو آں ذوق و شوق
عالماں از علم قرآں بے نیاز — صوفیاں درندہ گرگ و مو دراز
گرچہ اندر خانقاہاں ہائے و ہوست — کو جواں مردے کہ صہبا در کدوست
ہم مسلمانانِ افرنگی مآب — چشمۂ کوثر بجویند از سراب
بے خبر از سرِ دیں اند ایں ہمہ — اہلِ کیں اند اہلِ کیں اند ایں ہمہ
خیر و خوبی بر خواص آمد حرام — دیدہ ام صدق و صفا را در عوام
اہلِ دیں را باز داں از اہلِ کیں — ہم نشینِ حق بجو با او نشیں!
کرگساں را رسم و آئین دیگر است — سطوتِ پرواز شاہیں دیگر است

غرضکہ اس اہلِ کلیسا کے نظامِ تعلیم کو دین و اخلاق کے خلاف ایک سازش سمجھتے ہوئے پہلے طالب علم کی اندرونی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔

شاخِ گل پر چہک ولیکن — کر اپنی خودی میں آشیانہ
وہ بحر ہے آدمی کہ جس کا — ہر قطرہ ہے بحر بیکرانہ
غافل منشین نہ وقتِ بازی است — وقتِ ہنر است و کارسازی است

اور یہ کہ

منظور وہ طلب کر کہ تری آنکھ نہ ہو سیر

سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر — کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اپنی خودی کو — ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اُدھر پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب — سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

یا یہ کہ

سینے میں اگر چہ ہو دلِ گرم — رہ جاتی ہے زندگی میں خامی
نخچیر اگر ہو زیرک و چست — آتی نہیں کام کہنہ دامی
ہے آبِ حیات اسی جہاں میں — شرط اس کے لیے ہے تشنہ کامی
غیرت ہے طریقتِ حقیقی — غیرت سے ہے فقر کی تمامی

اقبال کے نزدیک خودی کی تربیت پہلا زینہ ہے جس پر کسی نوجوان کو قدم رکھنا ہے جو کوئی اس بنیادی اصول سے ناواقف ہے اس کی تربیت غیر مکمل اور اس لیے اُس کی زندگی بے کار و بے مصرف۔ خودی کی پرورش، صحیح تربیت پر موقوف ہے تاکہ مشتِ خاک میں آتشِ ہمہ سوز پیدا ہو سکے۔

یہی ہے بہر کلیمی ہر اک زمانہ میں — ہوائے دشت و شعیب و شبانیٔ شب و روز

وہ ہندی مکتبوں سے ناامید ہیں کہ محکوم اپنے حق میں موسیقی و صورتگری د

وعلم نباتات ہی کی تحصیل اچھی تعلیم سمجھتا ہے، ساتھ ہی شیخ مکتب کے طریقوں سے بھی کسی طرح کی امید نہیں رکھتے کہ وہ کشادہ دل، نہیں رکھتے پھر بھی طالب علموں سے ہمدردی رکھتے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

کیونکہ

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش

اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش

فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جسمیں رکھدی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

اور یہ ذوق خراش کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ نظر سے۔ یہ فیضانِ نظر ہی کی دولت تھی جس نے ابراہیم کو آداب فرزندی سکھائے تھے۔

صد کتاب آموزی از اہلِ ہنر
خوشتر آں درسے کہ گیری از نظر

ہر کسے زاں مے کہ ریزد از نظر
مست می گردد باندازِ دگر

از دمِ بادِ سحر میرد چراغ
لالہ زاں بادِ سحر مے در ایاغ

کم خور و کم خواب و کم گفتار باش
گردِ خود گردندہ چوں پرکار باش

شیوۂ اخلاص را محکم بگیر
پاک شو از خوفِ سلطان و امیر

عدل در قہر و رضا از کف مدہ
قصد در فقر و غنا از کف مدہ

حکم دشوار است؟ تاویلے مجو
جز بقلبِ خویش قندیلے مجو!

حفظِ جانہا ذکر و فکرِ بے حساب
حفظِ تنہا ضبطِ نفس اندر شباب

حاکمی در عالم بالا و پست — جز بحفظ جان و تن ناید بدست
لذت سیر است مقصود سفر — گر نگہ بر آشیاں داری مپر
ماہ گردد تا شود صاحب مقام — سیر آدم را مقام آمد حرام
زندگی جز لذت پرواز نیست — آشیاں با فطرت او ساز نیست
رزق زاغ و کرگس اندر خاک گور — رزق بازاں در سواد ماہ و ہور!

(جاوید نامہ)

یعنی نوجوانانِ ملت آپس میں محبت پیدا کریں۔ قہر و غضب کی حالت میں بھی عدل کو ہاتھ سے نہ دیں، اطمینان و بے فکری و عیش میں بھی دیدۂ دل وا رکھیں ضمیر کو پاک اور دل کو بلند اور وسیع بنائیں۔ جوانی میں نفس کو قابو میں رکھنے کی کوشش کریں اور آخر یہ کہ پرواز سے کبھی غافل نہ رہیں۔ اس لیے کہ توکل اور استغنا جمود کے ہم معنی ہیں۔ ایک زندگی یوں بھی ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے کہ دریوزہ گری کی جائے یعنی دوسروں کی محنتوں پر کتوں کی طرح جیا جائے ایک زندگی یہ ہے کہ شاہین و باز کی طرح اپنی زندگی کے لیے خود جد و جہد کی جائے اور ہر روز اپنے اوپر جہد اپنے رزق کے لیے اختیار کیا جائے۔

علم بغیر سوزِ دل کے بالکل بے کار ہے اگر دل کی تربیت نہ ہوئی اور علم اس کو نہ سنوار سکا، اس کی تربیت نہ کر سکا تو کرمِ کتابی کی طرح ابو سینا و فارابی کی ورق گردانی سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ علم اگر زندگی کو نہ بنا سکے تو ایسے علم سے کیا حاصل ہو۔ علم زندگی کو اسی وقت بنا سکتا ہے جب دل میں سوز و تپش پیدا ہو جائے ورنہ یوں کتابیں تو اتنا کور ذوق بنا دیتی ہیں کہ صبا سے بوئے گل کا بھی سراغ نہیں مل پاتا۔

نکو گفت پروانۂ نیم سوزے — کہ این نکتہ را در کتابے نیابی
تپش می کند زندہ تر زندگی را
تپش می دہد بال و پر زندگی را

پھر آگے تلقین یہ ہے کہ ایک نوجوان میں ادب و آدمیت ہونا چاہیے انسانیت کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کے ساتھ خواہ وہ کافر ہو یا مومن برابر کی شفقت کرنا چاہیئے۔ بری صحبتوں سے بچنا چاہیئے کہ مرد کا ستر یہی ہے۔

دین دراصل کیا ہے محض طلب و ذوق و شوق میں جلنا، اور یہ طلب ادب و احترام سے پیدا ہوتی ہے جس کا انجام عشق ہوتا ہے لیکن اور ادب و احترام کا نوجوان میں پیدا ہونا اس کی اندرونی اصلاح کے لیے پہلا اور ضروری سبق ہے۔

دیں سراپا سوختن اندر طلب — انتہایش عشق و آغازش ادب
آبروئے گل ز رنگ و بوئے اوست — بے ادب بے رنگ و بو بے آبروست
نوجوانے را چو بینم بے ادب — روز من تاریک می گردد چو شب
تاب و تب در سینہ افزاید مرا — یاد عہد مصطفیٰ آید مرا
از زمان خود پشیماں می شوم — در قرون رفتہ پنہاں می شوم
ستر زن یا زوج یا خاک لحد — ستر مرداں حفظ خویش از یار بد
حرف بد را بر لب آوردن خطاست — کافر و مومن ہمہ خلق خداست
آدمیت احترام آدمی — با خبر شو از مقام آدمی
آدمی از ربط و ضبط تن بہ تن — بر طریق دوستی گامے بزن

بندۂ عشق از خدا گیرد طریق ❊ می شود بر کافر و مومن شفیق
کفر و دیں را گیر در پنہائے دل ❊ دل اگر بگریزد از دل، وائے دل

یا

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی ❊ خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ
حیا نہیں ہے زمانہ کی آنکھ میں باقی ❊ خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

تیسرا سبق وہ نوجوانوں کو یہ دیتے ہیں کہ خواہ تم کہیں کا بادشاہ کیوں نہ ہو لیکن فقر کو ہاتھ سے نہ دینا۔ فقر کے معنی یہ ہیں کہ دنیا سے دل کو الگ رکھنا۔ باہمہ و بے ہمہ رہنا۔ دنیا کی کسی شے سے محبت نہ رکھنا۔ دنیا میں کسی چیز کی طلب نہ رکھنا سوائے درد و سوزِ دل کے، نعمتوں کی کثرت اور فراوانی، اسبابِ تعیش انسان کو اندھا بنا دیتی ہے اس کے دل میں سوز نہیں رہتا۔ وہ علائق دنیوی میں اس قدر پھنس جاتا ہے کہ پھر اس کو اپنی روح کی پرورش کی فکر نہیں رہتی۔ حق بات نہ وہ کہنا چاہتا ہے نہ سننا۔ صداقت سے وہ دور رہنے لگتا ہے، جب یہ حالت ہو جاتی ہے تو پھر دکھ، مصیبتیں اور تکالیف روحانی شروع ہو جاتی ہیں۔ اس لئے اقبال نوجوانوں کو آگاہ کرتا ہے کہ ہم خواہ کتنے اعلیٰ مراتب دنیوی پر کیوں نہ پہونچ جائیں لیکن دل درویش رہنا چاہیئے۔ آدمی وہی ہے جو دولت حاصل کر کے نشہ پر مست نہ ہو جائے جو ضمیر پاک و نگاہ بلند و مستی شوق رکھے نہ کہ "مالِ و دولتِ قارون و فکرِ افلاطون"۔

گرچہ باشی از خداوندانِ دہ ❊ فقر را از کف مدہ، از کف مدہ
در جہاں جز دردِ دل ساماں مخواہ ❊ نعمت از حق خواہ و از سلطاں مخواہ

اے بسا مردِ حق اندیش و بصیر — می شود از کثرتِ نعمت ضریر
کثرتِ نعمت گداز از دل برد — ناز می آرد نیاز از دل برد
من فدائے آں کہ درویشانہ زیست — وائے آں کو از خدا بیگانہ زیست

اس کے ساتھ ہی اس بات کی صلاح بھی ہے کہ یہ زمانہ ایسا آ لگا ہے جس میں لوگ جسم کو جان پر فوقیت دیتے ہیں اور جسم کی خبر گیری کرتے ہیں جان کی نہیں اس لئے مسلمان نوجوان کو یہ بھی چاہیئے کہ کسی ایسے مردِ حق کی پیروی کرے جو اس کے زمانہ میں ہو کیونکہ ایسا شخص

اول اندر نارِ خود سوزد ترا! — باز سلطانی بیاموزد ترا
ما ہمہ یا سوز او صاحب دلیم — ورنہ نقش باطلِ آب و گلیم

اور ایسا شخص اپنے اپنے زمانہ میں کبھی کلیم کہلاتا ہے کبھی مسیح، کبھی خلیل، اور کبھی محمد لیکن اگر ایسا شخص تجھ کو نہ مل سکے یا کسی ایسے ہی مردِ حق کی باتوں سے تو واقف نہ ہو سکے تو پھر گزرے ہوؤں میں سے کسی ایسے کو اپنا راہبر بنا جو تیری روح کو رقص میں لے آئے تا کہ تجھ میں سوز، تپش، ہمدردی، اور ذوق و شوق پیدا ہو سکے۔

ترسم ایں عصرے کہ تو زادی دراں — در بدن غرق است و کم داند ز جاں
گر نیابی صحبتِ مردِ خبیر — از اب وجد آنچہ من دارم بگیر
پیرِ رومی را رفیقِ راہ ساز — تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومی مغز را داند ز پوست — پائے او محکم فتد در کوئے دوست
رقصِ تن از حرفِ او آموختند — چشم را از رقصِ جاں آموختند

رقص تن در گردش آرد خاک را — رقص جاں برہم زند افلاک را
رقص جاں آموختن کارے بود — غیر حق را سوختن کارے بود
تا ز نارِ حرص و غم سوزد جگر — جاں برقص اندر نیاید اے پسر
ضعفِ ایماں است و دلگیری است غم — نوجوانا! نیمہ پیری است غم
می شناسی! حرص، فقرِ حاضر است — من غلامِ آنکہ بر خود قاہر است
اے مرا تسکینِ جانِ ناشکیب — تو اگر از رقصِ جاں گیری نصیب

ظاہر ہے جب جان رقص میں آجائے گی اور اُس میں سوز و گداز پیدا ہو جائے گا تو ایسی زندگی دین کی زندگی ہوگی، ایسی زندگی مضبوط زندگی ہوگی اور اب اگر وہ لاالٰہ کہے گا تو زمین و آسمان گردش میں آجائیں گے ورنہ یوں خالی ہونٹوں سے کہہ دینا محض ایک ذراسی محدود ہوا کو حرکت دیدینا ہے۔

در رہِ دیں سخت چوں الماس زی — دل بحق بربند و بے وسواس زی
سرِّ دیں صدقِ مقال، اکلِ حلال — خلوت و جلوت تماشائے جمال!
لاالٰہ گوی؟ بگو از روئے جاں — تا ز اندامِ تو آید بوئے جاں
مہر و مہ گردد ز سوزِ لاالٰہ — دیدہ ام ایں سوز را در کوہ و کہ
ایں دو حرف لاالٰہ گفتار نیست — لاالٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست
زیستن با سوزِ او قہاری است — لاالٰہ ضرب است و ضربِ کاری است

ظاہر ہے اقبال کا ایسا نوجوان کس قدر با محبت، کس قدر بلند ہمت کس قدر سخت کوش اور زندگی کی جدوجہد کے لیے کس قدر پامرد یا امید اور تیار نظر آئے گا۔ اس کے علاوہ ایسا جوان آزاد ہو گا غلام نہیں۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اپنے بیٹے جاوید اقبال کو ایک خط میں یوں نصیحت کرتے ہیں۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر | نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو | سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں | سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے | خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

یا

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے | ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

یا

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت | دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا

ضربِ کلیم میں محراب گل افغان کے افکار میں اپنا مثالی نوجوان یوں پیش کرتے ہیں۔

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا | شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر | اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

عجب نہیں ہے اگر اسکا سوز ہی ہمہ سوز — کہ نیستاں کیلئے بس ہے ایک چنگاری
خدا نے اُس کو دیا ہے شکوہ سلطانی — کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کراری
نگاہ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو — یہ بے کلاہی ہے سرمایۂ کلہُ داری

یہی نہیں بلکہ خدا سے بھی دعا کرتے ہیں۔

جگر سے وہی تیر پھر پار کر — تمنا کو سینوں میں بیدار کر
ترے آسمانوں کی تاروں کی خیر — زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوز جگر بخشدے — مرا عشق، میری نظر بخشدے

اقبالؔ کے نزدیک وہ جوان ہنگامۂ پیکار کے لائق نہیں جو نالۂ مرغان سحر سے مدہوش ہو جائے عیش اور اطمینان نوجوانوں کے لیے جمود اور موت ہے طلباء علی گڈھ کالج کو متوجہ کرتے ہیں۔

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں
کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے
جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے
موت ہے عیش جاوداں ذوق طلب اگر نہ ہو
گردش آدمی ہے اور گردش جام اور ہے
شمع سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز
غم کدۂ نمود میں شرط دوام اور ہے

سرسیدؔ کو بھی سمجھاتے ہیں۔

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں
ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا فرقہ بندی کیلئے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہ محشر یہاں

موجود گروہِ اساتذہ کو وہ اس قابل نہیں سمجھتے کہ جوانوں کی تعلیم ان کے سپرد کی جائے کیونکہ وہ خود بھٹکے ہوئے ہیں انھیں خود راہ کی خبر نہیں ہے اور جب خود انھیں خبر نہ ہو گی تو وہ کسی دوسرے کو راستہ کیونکر بتا سکیں گے

پیشِ خورشید بر مکش دیوار
خواہی ار صحنِ خانہ نورانی

یا

(شیخ مکتب سے بال جبریل)

مقصد ہو اگر تربیت لعل بدخشاں
بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو
دنیا ہے روایات کے پردوں میں گرفتار
کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو
کر سکتے تھے جو اپنے زمانہ کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانہ کے ہیں پیرو

فلسفہ کو وہ نوجوانوں کے لیے مفید نہیں سمجھتے اس لئے کہ فلسفہ حرکت کو فنا کرتا ہے اور بے حرکتی موت ہے۔

انجام خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت
ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت
دیں مسلک زندگی کی تقویم
دیں سرِّ محمدؐ و براہیم
دل در سخنِ محمدی بند
اے پور علی ز بو علی چند؟

نہ صرف شعر و شاعری ہی میں علامہ اقبال نوجوانوں کی تعمیر سیرت پر زور دیتے تھے، بلکہ وہ زبانی بھی اسی قسم کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ لاہور کے چند نوجوان طلبا علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انکے جلسۂ مشاعرہ کی

صدارت کے لئے درخواست کی۔ علامہ نے فرمایا خیر میں صدارت تو کرتا نہیں، لیکن شاعری تم لوگوں کے لئے بہت مضر ہے اور پھر اس کے بعد موجودہ شاعری اور اس کے بے فائدہ ہونے پر ایسا لکچر دیا کہ ان نوجوانوں کا تمام جذبہ شعری یک لخت ٹھنڈا ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ نوجوانوں کی جو حالت عرصہ تک رہی ہے یعنی یورپ کی کورانہ تقلید۔ احساس غلامی غائب، خود پر بھروسا نہ ہونا، تعلیم کو محض ذریعہ معاش یا ذریعہ وجاہت سمجھنا کالج میں بیٹھ کر خالی ڈینگیں مارنا۔ ظاہر کو اصل حقیقت جاننا۔ خود غرضی اور اس لئے آپس میں نفاق۔ ظاہری اور حواسی چیزوں پر یقین رکھنا اس لئے بیدینی لامذہبی، تن کی پرورش اور روح کی تربیت سے نا آشنا محض ہونا ظاہر ہے کہ جس قوم کے افراد کا یہ مطمح نظر ہوگا اس قوم کی بقا کیونکر ہو سکتی ہے۔ اب جبکہ قومیں زندگی کی دوڑ میں مصروف ہیں اور عرصۂ کائنات میں فنا و بقا کا سخت معرکہ گرم ہے جس نے ہاتھ پاؤں ڈالدیے یا جو نرم بستر کا جویا ہوا یقینی اس کو دوسری قومیں کچلتی ہوئی اور روندتی ہوئی آگے نکل جائیں گی۔ کیا مسلمان قوم اس قابل ہے کیا اس میں زندگی کی اس قدر قوت ہے کہ وہ موجودہ تنازعہ اللبقار کی گرما گرمیوں کی تاب لاسکے؟ جواب اثبات میں کیونکر دیا جاسکتا ہے اس لئے کہ اب وہ مسلمان مسلمان ہی نہیں رہا، اب مسلمان اور مسلمان بچے جیسے رہ گئے ہیں اُن کی صورت اُن کی حالت یہ ہے

مومن و پیش کساں بستن نطاق | مومن و غداری و فقر و نفاق
با پشیزے دین و ملت را فروخت | ہم متاع خانہ و ہم خانہ سوخت

لا الٰہ اندر نمازش بود و نیست — ناز ہا اندر نیازش بود و نیست
نور در صوم و صلوٰۃ او نماند — جلوۂ در کائناتِ او نماند
آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ — فتنۂ او حبِ مال و ترسِ مرگ
رفت ازو آں مستی و ذوق و سرور — دینِ او اندر کتاب و او بہ گور
صحبتش از عصرِ حاضر در گرفت — حرفِ دیں را از دو پیغمبر گرفت
آں ز ایراں بود و آں ہندی نژاد — آں ز حج بیگانہ و ایں از جہاد
تا جہاد و حج نماند از واجبات — رفت جاں از پیکرِ صوم و صلوٰۃ
سینہ ہا از گرمیِ قرآں تہی — از چنیں مرداں چہ امیدِ بہی

از خودی مردِ مسلماں در گذشت
اے خضر دستے کہ آب از سر گذشت

سجدۂ کز وے زمیں لرزیدہ است — بر مرادش مہر و مہ گردیدہ است
سنگ اگر گیرد نشانِ آں سجود — در ہوا آشفتہ گردد ہمچو دود
ایں زماں از سر بزیری ہیچ نیست — اندرو جز ضعفِ پیری ہیچ نیست
آں شکوہِ ربی الاعلیٰ کجاست — ایں گناہِ اوست؟ یا تقصیرِ ماست
ہر کسے بر جادۂ او تند رو — ناقۂ ما بے زمام و ہرزہ دو

صاحبِ قرآں و بے ذوقِ طلب
العجب ثم العجب ثم العجب

(جاوید نامہ)

اپنے گذشتہ سے ہم سبق نہیں لیتے۔ حال کی کیفیتوں اور زار حالتوں کو

دیکھتے ہیں لیکن آنکھیں بند کر لیتے ہیں، آئندہ کے ہولناک نتائج رہ رہ کر اپنا بھیانک چہرہ ہم کو دکھلاتے ہیں لیکن ہم ہیں کہ بے فکر اور لا پرواہ بیٹھے ہیں، ہم کو اپنے میں اعتبار نہیں رہا۔ خود میں زور اعتماد نہیں رہا۔ فنا (ویدانت اور بودھ مذہب والی) کو ہم بقا سمجھنے لگے ہیں اور اپنی کشتی موجوں کے تلاطم میں بغیر کسی پتوار یا ناخدا کے ڈال رکھی ہے، ہم خود قرآن کو پس پشت ڈال دینے کی وجہ سے اپنا راستہ تاریکیوں میں بھلا بیٹھے ہیں ایسے حالات میں اقبال کی آواز پر لبیک نہ کہنا گویا موت و ذلت کو یقینی دعوت دینا ہے۔ اقبال کی بانگ کہ اپنی خودی میں یقین رکھو، نا امیدی بھول جاؤ۔ دل میں درد اور تپش پیدا کرو۔ دل کو بلند اور روح کو سر بلند کرو۔ فقر کو جادۂ راہ بقا سمجھو۔ راہ حق اور راہ دین میں گامزن ہو۔ یہ ایسی بانگ درا ہے کہ سونے والوں کو بغیر چونکائے نہیں رہ سکتی اور مست اور نیند کے متوالوں کو ایسا ہلا دے گی، ایسا جھنجھوڑ دے گی کہ وہ لامحالہ آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

لیکن ایک سوال یہاں پر پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کا یہ نوجوان عملی ہے یا محض خیالی۔ یعنی یہ کہ وہ نوجوان جو اقبال کے دل و دماغ میں ہے کیا دنیا میں واقعی طور پر ایسا ہونا اور ایسا تربیت اور تعلیم سے بن جانا ممکن ہے؟ بیجا طور پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ جوانی جس میں شباب فطرتاً جوش اور نمائش خودی پر بہت مائل ہوتا ہے کیا اقبال کے فقر کی تلقین دل پر رکھ سکتا ہے۔ اور اس پر عمل پیرا ہو سکتا ہے؟ کیا وہ دنیا اور علائق دنیا سے اپنے دل کو الگ کر سکتا ہے جبکہ ہر ہر قدم پر اس کے لیے لغزش کے سامان موجود رہتے ہیں کیا وہ اس دنیا سے جس کو بہت رنگین

دیکھتا اور سمجھتا ہے یوں دل برداشتہ ہو سکتا ہے کہ اس میں بھی وہ ہے اور اس سے الگ بھی رہے باہمہ اور بے ہمہ کا اصول اہلِ شباب کے لیے ناممکن ہی سا معلوم ہوتا ہے۔ دل میں فقر پیدا کرنا۔ جوانی میں اپنے دل کو بوڑھا بنا لینا ایک دماغی بیماری کہی جا سکتی ہے نہ کہ اس کا صحیح استعمال۔

اقبال کے پیغامِ فقر کی غلط تشریح ہوگی اگر اس سے اس قسم کے شکوک پیدا ہوں۔ اقبال کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ نوجوان اپنے احساسات یا جذبات یا خیالات میں کسی طور پر بوڑھا ہو جائے۔ بلکہ وہ تو ایک ابدی شباب جوش اور ذوقِ عمل کی تلقین کرتا ہے یہ صحیح ہے کہ زمانۂ شباب تمام و کمال رنگینیاں اور دلچسپیاں اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے اور اپنے باہر کی دنیا بھی رنگین و دلچسپ دیکھتا ہے لیکن وہ یہ تو نہیں کہتا کہ اس رنگینیٔ تخیل کو ختم کر دو۔ اقبال برہم چریوں کی طرح نفس کو فنا کرنے کی ترغیب نہیں دیتا کیونکہ وہ اس کے سخت خلاف ہے (ملاحظہ ہو "واقعہ برہمچاری چند گھنٹے علامہ اقبال کے ساتھ" معارف ستمبر ۳۸ء) بلکہ وہ یہ بتاتا ہے کہ یہ ثانوی چیز ہے اول شے حق کی راہ میں جد وجہد اور اپنی خودی کی تعمیر ہے اور اپنے کردار و سیرت کی تربیت۔

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

لیکن شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہونے سے پیشتر مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کرنا شرطِ اول ہے اس کے علاوہ اقبال کا نوجوان خیالی نہیں کہا جا سکتا اس لیے کہ اول تو اقبال کی تلقینِ جد وجہد جوش و سرگرمی کیا تھ

عین فطرتِ شباب کے مطابق ہے اس کے علاوہ طبیعت میں استغنا ہمت پامردی اور خود اعتمادی کا پیدا کرنا بھی جوانی کی نفسیات سے بالکل مناسب ٹھہرے گا، اس لیے کہ جوانی ہی میں آدمی اپنے میں زور و سوز محسوس کرتا ہے۔ جوانی ہی میں وہ ہر چیز فتح کرنے اور ہر شے پر قدرت حاصل کرنے کا طامع ہوتا ہے اور جوانی ہی میں اپنی محنت و کوشش کے اعتماد پر اپنے میں آسانی سے شانِ استغنا پیدا کر سکتا ہے۔ بڑھاپا ضعف قویٰ کا زمانہ ہے اور کمزوری کی وجہ سے حرص دنیا اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اپنے میں وہ شان بے نیازی نہیں پیدا کر سکتا جتنا کہ ایک نوجوان اپنے دل میں پیدا کر سکتا ہے اور اسی شان بے نیازی کا دوسرا نام فقر ہے اپنے نظریۂ فقر کی اقبال مزید تشریح اس طرح کرتے ہیں۔

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر ۔۔۔ جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا ۔۔۔ اللہ کی شانِ بے نیازی
کنجشک و حمام کے لئے موت ۔۔۔ ہے اس کا مقام شاہبازی
روشن اس سے خرد کی آنکھیں ۔۔۔ بے سرمۂ بوعلی و رازی
حاصل اس کا شکوہِ محمود ۔۔۔ فطرت میں اگر نہ ہو ایازی
تیری دنیا کا یہ سرافیل ۔۔۔ رکھتا نہیں ذوق نے نوازی
ہے اس کی نگاہ عالم آشوب ۔۔۔ در پردہ تمام کارسازی
یہ فقر غیور جس نے پایا ۔۔۔ بے تیغ و سناں ہے مرد غازی

مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری

(جاوید سے۔ ضربِ کلیم)

اقبال کا پیامِ عمل اور اقبال کی اصلاح جدید جدید نوجوانوں کے خون کو گرم کرتی ہے اور چونکہ گرمیِ شباب کا تقاضا ہے اس لیے کسی طور پر نہیں کہا سکتا کہ اقبال کا پیغام جوانوں کی فطرت کے مطابق نہیں ہے رہی وہ باتیں جن کی تربیت کی اقبال نے تاکید کی ہے وہ ان میں پہلے سے موجود ہوتی ہیں اس لئے ذراسی تربیت سے ان خصائص کو غیر معمولی طور پر ترقی دی جاسکتی ہے مثلاً کون جوان ایسا ہوتا ہے جس کے دل میں حوصلہ مندی عزم وہمت کے جذبات نہیں ہوتے۔ اسی جذبہ حوصلہ مندی کو اقبال اور بھی اکسانا چاہتے ہیں اس قدر کہ اس کو زمین و آسمان کا مالک بنا دینا چاہتے ہیں بلکہ ذوق طلب اس قدر بلند دیکھنا چاہتے ہیں کہ کسی مقام پر رک جانا یا کسی خاص جگہ کو منزل قرار دے دینا وہ نوجوان کے ذوق تشنگی اور حوصلہ کی پستی قرار دیتے ہیں۔

تو رہ نوردِ شوق ہے؟ منزل نہ کر قبول — لیلیٰ بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز — ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

ظاہر ہے نوجوانوں کو اس قسم کی تلقین ان کی فطرت کے کس قدر مطابق ہے اور کیونکر تخیلی کہی جاسکتی ہے!

اقبال کے اس نوجوان کے متعلق ایک دوسرا سوال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا وہ شعار و روایات اسلامی کے مطابق ہے؟ صوفیاء کرام تو اس سے قبل ذات کو فنا کر دینے کی تعلیم دیا کرتے تھے، اور قرآن سے اس کی تاویلیں بھی پیش کرتے تھے جبر کو اصولِ زندگی مانتے تھے، اور خود کو مٹا کر خدا پر تکیہ کرنا شرائطِ ایمان میں سے سمجھتے تھے۔ یہ آخر اقبال نے کیوں اور کیسے خودی

بقا اور خودی کی مقدرت کے اصول قرآن سے استنباط کر لیئے۔

درحقیقت ایران کا تصوف یعنی خودی کے بطلان کا اصول ویدانت اور بدھ مت کے اصولوں کے موافق تھا جیسا کہ علامہ اقبال نے اپنے مقالہ ایران کے فلسفہ میں ثابت کیا ہے اور اکثر خطوط میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے کہ یہ طریقہ تفکر ایران میں انھیں مذاہب کے پیرؤں کی تعلیم سے وہاں پہنچ چکا تھا اس لیے وہاں کے تفکر و تخیل پر جاری و ساری ہو گیا ورنہ ظاہر ہے کہ یہ چیز سامی نسلوں میں قطعی موجود نہ تھی۔ اور یوں بھی یہ آریائی قوموں کی چیز ہے اور اپنے اس خیال میں اقبال کو رومی سے بہت کچھ مدد ملی جس نے جبر و قدر کے مسئلہ کو دو لفظوں میں بالکل واضح کر دیا کہ

بال بازاں را سوئے سلطان برد

بال زاغاں را بہ گورستان برد

اس کے علاوہ یہ بات قرآن سے بھی ظاہر ہے جس میں صاف کہدیا گیا ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی نہیں ملتا کسی کو مگر اتنا جتنے کے لیئے وہ محنت کرے اور بالکل یہی چیز ہے جو رومی نے بتلائی ہے کہ جس میں جتنی ہمت و جرأت ہوتی ہے اتنا ہی اس کا رتبہ بلند ہوتا ہے ورنہ یوں زاغ اور باز دونوں کے پر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ خودی کی فنا اور بقا کے متعلق قرآن شریف کا صاف حکم موجود ہے کہ لا تحزنوا ولا تقنطو ظاہر ہے کہ جب یہ حکم دیا جائے گا کہ نہ غم کرو اور نہ ناامید ہو تو اس سے کبھی یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ اپنی خودی کو مٹا دو۔ اور اپنی خودی کا مٹانا تو اسی وقت ہو سکتا ہے

جب زندگی اور دنیا کو ہر طرح ہیچ سمجھا جائے اور یہی بدھ مذہب کا خاص پرچار ہے کہ زندگی جینے کے لائق نہیں اور دنیا فانی ہے اور دکھ اور فساد سے بھری ہوئی اس لئے اس میں جی لگانا بیکار ہے زندگی بدھ کے مطابق فقیری میں اور بھکشو بن کر گزارنا چاہیئے خود کو فنا سمجھ کے اور بے ہمہ رہ کے اسلام نے اس قسم کی رہبانیت کی کبھی تعلیم نہیں دی۔ لا رھبانیۃ فی الاسلام اسلام نے مادہ کی حقیقت سے انکار کبھی نہیں کیا اور نہ اس سے الگ رہنے یا بچا کرنے کی کبھی تعلیم دی۔ ہاں مادہ سے اپنی ذات اور روح کو بلند رکھنے کی البتہ تلقین کی ہے۔ مادیات کو مقصد بالذات نہیں بنایا ہر چند کہ انسان کی زندگی ہر چہار طرف بظاہر مادہ سے گھری ہوئی ہے لیکن یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ انسان اپنے دیدہ و دل وا رکھے اور محض مادہ ہی میں نہ متوجہ رہے اور اسی کو اقبال فقر کہتے ہیں۔

دلا رمز حیات از غنچہ دریاب — حقیقت در مجازش بے حجاب است
زخاک تیرہ می روید ولیکن — نگاہش بر شعاع آفتاب است

ان دلائل کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اقبال ایک مومن نوجوان کو جو خودی کی تعمیر کی اور بے خوفی کی تعلیم دیتا ہے وہ سراسر قرآن کے احکام کے مطابق ہے لا خوفٌ علیہم ولا ہم یحزنون اس کی تلقین میں جاری و ساری ہے رہا یہ امر کہ انھوں نے صرف مسلمان نوجوانوں کو کیوں مخاطب کیا۔ کیا دوسرے جوانوں میں اس قسم کی کمزوریاں نہ تھیں جو مسلمان نوجوانوں میں پائی جاتی ہیں یا کیا یہی تعلیم دوسرے جوانوں کے لئے مفید نہ ہوگی اس امر کا شافی جواب ان کے ایک خط میں مل سکتا ہے جو انھوں نے ڈاکٹر نکلسن کو اپنے ایک معترض مسٹر ڈکنس

کے متعلق لکھا ہے جو کہتا تھا کہ ان کا تخاطب مسلمانوں ہی سے صرف ان کی محبت اسلام کی وجہ سے ہے۔

" یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بیحد محبت ہے لیکن مسٹر ڈکنس کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیش نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے بلکہ دراصل میرے لیئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کیلئے موزوں واقع ہوئی ہے۔ مسٹر ڈکنس کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائنات انسانیت کے اتحاد عمومی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے اور کہتا ہے

تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اقبال کی موجودہ مسلم نوجوان کی بیماری کی تشخیص صحیح ہے اور کیا ان کا طریقہ علاج جو انھوں نے بتایا ہے وہ مفید ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں کیا اقبال کا نوجوان موجودہ تنازعۃ البقا اور کشمکش کو سر کرنے کے لائق اور اس میں کامیاب ثابت ہوگا اور کیا اس قدر کامیاب ہوسکے گا کہ وہ دوسروں سے بازی لے جاسکے۔

یہ تو بالکل عیاں ہے کہ مسلمان من حیثیۃ القوم آجکل بہت پستی کی حالت میں ہیں دوسری قومیں ان سے بہت آگے بڑھ گئی ہیں مسلمان بالکل جمود کی حالت میں ہیں اس لئے کہ کوئی راہ عمل ان کے سامنے نہیں ہے وہ ہر قوم کو آگے بڑھتے دیکھتے ہیں اور تکتے ہوئے رہ جاتے ہیں، آپس میں نفاق الگ، افراد کے سردار الگ،

ــبے ذوق وپست، نہ ارادوں میں زور نہ ولولوں میں شور، اس تمام پستی کی اصل وجہ کیا ہے ــ؟ پہلی وجہ تو یہی کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے دوسری وجہ یہ کہ غلط تعلیم و تربیت

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا

ظاہر ہے کہ ایسی تعلیم پائے ہوئے نوجوان کس قسم کے نکلیں گے

یہ بتان عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسوں میں
نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آذرانہ

یا

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

غرضکہ مسلمان اور مسلمان نوجوانوں کی جو حالت آج کل ہے اس کی تشخیص اور نبض شناسی اقبال نے بالکل صحیح کی ہے اب رہا طریقہ علاج! اقبال نے پہلے بنیادی کمزوری درست کرنا مناسب سمجھی اور اس کی درستی کے لیے ان کا پہلا اور اصلی گر خودی کی تلقین ہے جب انسان اپنے آپ کو صحیح راستے پر گامزن محسوس کرے گا تو ظاہر ہے اس کی وہ تمام قوتیں برسرِ کار آجائیں گی جو اس میں پنہاں ہیں اور یہی زندگی کا مقصد ہے کہ ہم اپنی تمام خوابیدہ قوتوں کو بیدار کریں اور اس طرح فطرت کے عطایا کا صحیح اور جائز استعمال ہو سکے۔ جب دل سے کمزوری کا احساس جاتا رہے گا اور نگاہ میں روشنی اور قلب میں گرمی آنا شروع ہو گی تو ایسا نوجوان جو کچھ نہ کر ڈالے

عجب نہیں۔

جس بندۂ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار — شمشیر کی مانند ہے برندہ و براق
اس کی نگہ شوخ پہ ہوتی ہے نمودار — ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے جو قوتِ اشراق

اور ایسا نوجوان جس کی خودی بیدار ہو گئی ہو اس کی زندگی کا کیا کہنا

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی — نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب — خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر

اقبال کا دوسرا گر فقر کی تلقین ہے اور درحقیقت یہ بہت بڑا اور اہم اصول ہے دنیا میں رہنا لیکن دنیا کو مقصد بالذات نہ سمجھنا، خاک سے اور خاک میں پیدا ہونا لیکن کرۂ خاکی سے اپنے کو سربلند رکھنا در اصل عزم و ہمت و حوصلہ کی بہترین تربیت ہے اور خصوصاً مسلمانوں کے لئے آجکل جب کہ ان کی اپنے نصب العین سے ناواقفیت اُن کو مختلف غلط راستوں پر ڈال دینے کے لئے آمادہ ہے۔ ابلیس زر و مال، خونریزی و جہانگیری، حرص و طمع کے جال پھیلائے ہوئے ہے اور مسلمان کے قدم اس کی طرف لڑکھڑاتے ہوئے اور اس غلط راستے پر بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں اقبال کی یہ بانگ فقر نہایت خوش آئند کہی جا سکتی ہے اس کے علاوہ اقبال کے کہنے کا طرز بھی کچھ کم موثر نہیں جوش اور روانی، زور و شور کے ساتھ جو ان کا اپنا ذاتی اسلوب ہے خون نوجوان کو گرم کرنے کے لیے بہت موزوں ہے وہ مسلمان نوجوان کو گذشتہ کی بھی یاد دلاتے ہیں اور گذشتہ کے حالات بتا کر اسے اکسانا اور آمادہ کرنا چاہتے ہیں کیونکہ تاریخ کی تعمیری قوت سے وہ بخوبی واقف ہیں اُن کے نزدیک

سر زند از ماضی تو حال تو — خیزد از حال تو استقبال تو

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے؟ وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارہ
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاج سر دارا

طنز سے بھی موقعے موقعے سے کام لیتے ہیں

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا موزوں نہیں مکتب کیلئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بے چارے ممولوں کی نظر سے پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

یا

شیخ مکتب کے طریقوں سے کشاد دل کہاں کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ!

غرضکہ ہر طرح سے وہ مسلم خوابیدہ کو بیدار کر دینا چاہتے ہیں دل میں درد ہے اس لیے ہر جگہ اور ہر انداز سے کوشش کرتے ہیں کہ مسلمان نوجوان بیدار ہو جائیں۔

اب رہی یہ بات کہ ایسا نوجوان موجودہ دنیا میں اپنا کیا درجہ رکھے گا؟ ظاہر ہے کہ جب خودی میں استوار پیدا ہو جائے گا اور اپنے میں اس قدر اعتماد ساتھ ہی دل میں وسعت نگاہ میں بلندی اور جان میں سوز تو ایسے نوجوانوں کے راستے میں کونسی رکاوٹیں حائل ہو سکیں گی صرف یہ نہیں کہ وہ موجودہ حالات زندگی کے موافق اپنے آپ کو بنا سکے گا بلکہ اپنی قوت روحانی کی بدولت وہ مصاف زندگی میں اس قدر طاقتور ثابت ہوگا کہ اپنے ماحول اور اپنے خارجی واقعات پر پورا پورا قبضہ و قدرت حاصل کر سکے گا۔ وہ محض اپنے زمانے اور وقت کی پابندی نہ کرے گا بلکہ اپنے زمانے اور وقت کو اپنا پابند بنائے گا۔ اس کے علاوہ چونکہ علامہ اقبال روح کی تربیت پر سراسر زور دیتے ہیں اس لئے ایسا نوجوان محض کسی خاص زمانے اور خاص عہد ہی کے لیے موزوں اور مناسب نہ سمجھا جائیگا

بلکہ تمام آنے والے عہدوں اور زمانوں کے لیے۔ کسی خاص مقام یا جغرافی چار دیواری کے لئے نہیں بلکہ ہر مقام اور ہر جگہ کیلئے مختصراً یہ کہ ایسا نوجوان ہمیشہ کے لیے مثالی رہے گا اس لیئے کہ روح کے لیے صحیح تعلیم اور صحیح راستہ کا مل جانا شرط ہے۔ گامزن تو وہ ہو ہی جائے گا۔ مسلمان قوم اب تک محض اس وجہ سے دوسروں کا منھ دیکھتی رہی اور دوسروں کی تقلید کرتی رہی کہ اسے اپنا جادہ یاد نہیں رہا تھا۔ عجمی تصوف نے انھیں غلط راستے پر لاکر ڈال دیا تھا اب جبکہ انھیں ایک درویش اور دانائے راز نے صحیح راستہ دکھا دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان قوم پھر گذشتہ کی طرح دوسری قوموں کے مقابلے میں سربلند اور ممتاز نہ نظر آنے لگے۔

اب ایک سوال اور رہ جاتا ہے وہ یہ کہ کیا مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر نوجوان یا مسلمان نوجوان یا کسی نوجوان کے لیے اس سے بہتر تعلیم ممکن ہے؟ بہتر و برتر ایک اضافی کلمہ ہے جو ہر زمان و مکان میں مختلف ہوا کرتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ زمانہ کی موجودہ حالت اور دنیا کی فی زمانہ رنگِ کشمکش دیکھتے ہوئے صحیح طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقبال کے نوجوان کا تصور مکمل، باعمل اور بہترین ہے، اور اس کے ساتھ ہی اتنا بھی ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اگر اس سے بہتر بھی کوئی مثالی نوجوان ممکن ہوا اور ساتھ ہی وہ عملی بھی ہوا تو اس کا بھی تخئیل اقبال ہی کے نوجوان کی داغ بیل پر قائم کیا جاسکے گا اور اسی کی محض ایک ترقی یافتہ صورت ہو گی نہ کہ اس سے مختلف۔

آخر میں بس اب یہی کہا جاسکتا ہے کہ خدا مسلمانوں کو اس کی توفیق دے کہ وہ اقبال کے پیغام کو سمجھیں اور اپنے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اس کے

بنائے ہوئے اصولوں پر کرائیں۔ کیونکہ ان اصولوں کا منبع اور مخرج قرآن ہے اور انھیں پر عمل کرنے سے وہ پھر دنیا میں سربلند اور نیک نام ہو سکتے ہیں

جوانوں کو مری آہ سحر دے ۔۔۔ پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے ۔۔۔ مرا نور بصیرت عام کر دے

تعلیم و تربیت کے متعلق اقبال کے چند مزید ارشادات حسب ذیل ہیں۔

ادب و تابے کہ باشد جاودانہ ۔۔۔ سمند زندگی را تازیانہ
بہ فرزنداں بیاموز ایں تب و تاب ۔۔۔ کتاب و مکتب افسون و فسانہ

ز علم چارہ سازے بے گدازے ۔۔۔ بسے خوشتر نگاہِ پاکبازے
نکو تر از نگاہِ پاکبازے ۔۔۔ دلے از ہر دو عالم بے نیازے

بہ آں مومن خدا کارے ندارد ۔۔۔ کہ در تن جان بیدارے ندارد
ازاں از مکتبِ یاراں گریزم ۔۔۔ جوانے خود نگہدارے ندارد

ادب پیرایۂ نادان و داناست ۔۔۔ خوش آں کو از ادب خود را بیاراست
ندارم آں مسلماں زادہ را دوست ۔۔۔ کہ در دانش فزود و در ادب کاست

ترا نومیدی از طفلاں روا نیست
چہ پروا گر دماغ شاں رسا نیست
بگو اے شیخ مکتب گر بدانی
کہ دل در سینۂ شاں ہست یا نیست

بہ پور خویش دیں و دانش آموز
کہ تابد چوں مہ و انجم نگینش
بدست او اگر دادی ہنر را
ید بیضاست اندر آستینش

نوا از سینۂ مرغ چمن برد
ز خون لالہ آں سوز کہن برد
بایں مکتب بایں دانش چہ نازی
کہ ناں در کف نداد و جاں ز تن برد

خدایا وقت آں درویش خوش باد
کہ دلہا از دمش چوں غنچہ بکشاد
بہ طفل مکتبی ما ایں دعا گفت
مپیچ نالے بہ بند کس میفتاد

کسے کو لالہ را در گرہ بست
ز بند مکتب و ملا بروں جست
باں دین و باں دانش مپرداز
کہ از ما می برد چشم و دل دوست

چو می بینی کہ رہزن کارواں گشت
چہ پرسی کاروانے را چساں گشت
مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی
کہ از وے روح قومے میتواں کشت

جوانے خوش گلے رنگیں کلاہے
نگاہ او چو شیراں مبے پناہے
بہ مکتب علم میشی را بیاموخت
میسر نایدش برگ گیاہے

خطوط واجد علی شاہ بنام شیدا بیگم

(واجد علی شاہ کے خطوط کے مجموعے اُن کی اپنی بیگمات کے نام اکثر ملتے ہیں۔ کچھ چھپ بھی چکے ہیں کچھ ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کی چہیتی بیگمات میں سے ایک کا نام شیدا بیگم تھا۔ یہ حسین علی خاں ساکن محلہ پاٹا نالہ لکھنؤ کی بیٹی تھیں۔ اور غدر کے بعد واجد علی شاہ کے ہمراہ کلکتہ (مٹیا برج) نہ جا سکی تھیں ان کے نام واجد علی شاہ کے اور ان کے واجد علی شاہ کے نام چند خطوط مخزن اسرار سلطانی میں شائع ہو چکے ہیں۔ (سال طباعت سنہ ۱۹۰۲ء) لیکن یہ مطبوعہ نسخہ بھی اب نایاب ہے صرف سیّد مسعود حسن رضوی صاحب کے پاس اس کا ایک مطبوعہ نسخہ موجود ہے اسی کتاب کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں ہے جس کا خلاصہ نصیر الدین ہاشمی صاحب نے رسالہ "آج کل" مطبوعہ اپریل سنہ ۵۴ء میں شایع کیا ہے۔

لیکن انھیں شیدا بیگم کے نام واجد علی شاہ کے خطوط کا ایک نہایت نادر کار نسخہ ابھی حال ہی میں میری نظر سے یہاں لکھنؤ میں گزرا۔ اس میں صرف سنہ ۱۲۷۲ھ و سنہ ۱۲۷۳ھ کے خطوط ہیں جو تاریخی ترتیب سے نمبروار لکھے گئے ہیں

کل خطوط کی تعداد اڑتیس ہے لیکن چونکہ یہ نسخہ ناقص الطرفین ہے یعنی شروع کا ایک صفحہ اور آخر کے نہیں معلوم کتنے صفحے غائب ہیں۔ اسلئے نہیں کہا جاسکتا کہ پورے نسخے میں کل خطوط کی تعداد کتنی ہوگی۔ سنہ ۱۲۷۲ھ میں کل آٹھ خط ہیں جن میں پہلا ناقص ہے۔ سنہ ۱۲۷۳ھ کے بقیہ تیس خطوں میں سے اکیسواں، ستائیسواں اور تیسواں ناقص ہیں۔ بائیسواں تا پچیسواں اور اٹھائیسواں ندارد ہیں۔ اس حساب سے تمام و کمال خطوط کی تعداد اس نسخہ میں انتیس ہے۔ یہ نسخہ موجودہ ناقص حالات میں چھبیس فل اسکیپ سائز کے اوراق پر مشتمل ہے اور زرکاری کی آپ اپنی مثال ہے۔ میں نے اس قدر مطلّا و مذہب کوئی نسخہ کسی کتاب کا اب تک نہیں دیکھا۔ ہر طرف تین طرف جدول میں کوئی ڈھائی انچ کی چوڑی بیل آب زر سے بنائی گئی ہے۔ ہر چوتھے صفحہ پر بیل کا ڈزائن بدل دیا گیا ہے۔ اجزاء کی سلائی کی جانب بھی کسی نہ کسی وضع کی پتلی بیل آب زر سے بنائی گئی ہے متن میں ہر صفحے پر صرف سات سطریں ہیں۔ اور بین السطور میں بھی سونے کا پانی بھرا گیا ہے۔ یہ سب نقش کاری کسی استاد فن کار کی رہین مو قلم معلوم ہوتی ہے کیونکہ بہت خوبصورت اور متناسب ہے نقوش میں پھول، پھل وحوش و طیور، مختلف شاہی سواریوں اور لکھنؤ کی مشہور شاہی عمارتوں کی عکاسی کی گئی ہے گمان غالب یہ ہے کہ یہ نسخہ خورشیدا بیگم کے لئے تیار ہوا ہوگا۔ افسوس ہے کہ یہ نسخہ اچھی طرح محفوظ نہیں کیا گیا ہے اور اگر کسی قدرداں کے ہاتھ نہ لگ سکا تو یقیناً ضائع ہو جائے گا۔

ذیل میں اس نسخہ کے تمام ناقص و مکمل خطوط کی نقل پیش کی جاتی ہے اصل

نسخے میں ہر تاریخ اور عنوان محبت نامہ اور نواب شیدا بیگم کا نام سرخ روشنائی سے درج ہے۔ لفظ "جان عالم" کہیں طلائی حروف میں کہیں سرخ روشنائی سے۔ اسی نسخے کے دو تین خطوط تصدق حسین صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ نے اخبار قومی آواز میں ۱۹۵۳ء میں شائع کرائے تھے

طوطی حسن کو گفتار میں کرتے ہیں اسیر
بلبلو کیا ستم ایجاد ہیں شیدا بیگم

آنکھ نے آنکھ سے دیکھا نہیں یہ چہرۂ خوب
قدرت حسن خداداد ہیں شیدا بیگم

مہر ہیں نور ہیں مہتاب ہیں پر دیں ہیں سہیل
چاند ہیں حور ہیں پری زاد ہیں شیدا بیگم

سیکڑوں سرو گلستاں میں بنے ان کے غلام
باغ عالم میں وہ آزاد ہیں شیدا بیگم

مردمک چشم کے ہیں رنگ ہیں رخساروں کے
خانۂ جان میں آباد ہیں شیدا بیگم

شہد و شکر نہ ملے ان کی ترش کامی سے
ہیں جو شیریں ہوں تو فرہاد ہیں شیدا بیگم

دیکھے اسکو کوئی اس بت خوش عشوہ میں
اختر زاری کی روداد ہیں شیدا بیگم

کیوں پیاری اب تو ہمارے دل کا حال خوب تم پر کھلا، سنو شیدا اب تاب مہاجرت نہیں، دل پُر درد میں طاقت نہیں دیکھیں تم سے کب ملیں گے کب دیکھیں گے اور یہ غزل ہم نے عجب وقت میں کہی ہے۔ خیر تمھارا دل خوب جانتا ہے اور رقعے جلدی جلدی لکھے جاؤ کہ اب یہی باعث تسکین ہے اس سے دل کے ٹھہرنے کا یقین ہے اور طبیعت کا اپنی حال کیا بیان کریں ویسے ہیں۔ فقط

راقم جان عالم محررہ چہارم ربیع الاولیٰ [1] ۱۲۷۲ھ

---

[1] یہ محبت نامہ اول کا آخری جزو ہے۔ ن

محبت نامہ دوم :-

آفتاب عالمتاب سمائے خوبی، دُرِ دریائے محبوبی، گلعذار، بتِ باوقار، نیک خو، آئینہ رو، رنگین ادا، مہ لقا نواب رشیدہ بیگم صاحبہ کو جان عالم غریب الوطن اسیر رنج و محن کی طرف سے معلوم ہو ۶ ربیع الثانی کو دو قطعہ خط محبت طراز تمہارے معرفت انجم الدولہ بہادر کے ہمارے پاس گئے کمال خوشی حاصل ہوئی. زردئی رخ وفور مسرت سے زائل ہوئی۔ مضمون مندرجہ حرف بحرف ظاہر ہوا۔ کمال اطمینان خاطر ہوا۔ عبارت محبت انگیز نے عجب رنگ دکھایا۔ زنگ کدورت آئینۂ دل محبت منزل سے چھڑایا۔ جب مضمون فراق پڑھا حال اشتیاق بڑھا، ہر چند بہ نسبت تحمل مزاجی کے ضبط کیا مگر بے اختیار اشک حسرت چشم تمنا سے گر پڑے اور سوئے فلک سے دیکھکر یہ مصرعہ پڑھا کہ کیوں اے ستمگار تیری جفا و ظلم کی آخر کچھ انتہا بھی ہے کب تک آخر تیری کجروی سے گردش میں رہے صدمۂ فراقگی کاہش میں رہے۔ خیر اگر اُس کا فضل شامل حال ہے تو فلک کو آزار کا محض خیال ہے دم بھر میں سب کام سنور جائیں گے، ساغر تمنا رحیق مراد سے بھر جائیں گے۔ اے جان اب کچھ تردد کا مقام نہیں، رنج کا کام نہیں مسہلوں سے ہمیں فراغت ہے۔ بحال طبیعت ہے خدا تمہاری بدمزگی مزاج کی دور کرے، ہمارا دل مسرور کرے اور پری خود ادا نگین آرا رقیہ بانو بیگم صاحبہ کو جو لکھا ہے کہ خدا نے حسن یوسفی دیا ہے۔ ماشاءاللہ بہت پیاری ہے بعینہ صورت تمہاری ہے مگر ابھی شکیل ہونے کا اعتبار نہیں۔ لڑکوں کو تا چلے قرار نہیں۔ ایسا نہ ہوگا انشاءاللہ روز بروز حسن و اقبال زیادہ ہوگا جاہ و جلال زیادہ ہوگا اور تم نے جو واسطے تیاری زیور کے صورت لکھی ہے۔ وہ آخر

نوٹ:- یہ خط غالباً ۱۲۷۳ھ کا ہے کیونکہ اس میں جس لڑکی کا ذکر ہے وہ ۱۲۷۳ھ میں پیدا ہوئی تھی دیکھئے خط دوازدہم سنہ ۱۲۷۳ھ م۔ ن

کیونکر منظور ہو جو عقل سے دور ہو۔ خدا نے ابھی بہت کچھ دیا ہے سرانجام اس امر کا کیا ہے۔ حکم واسطے تحریر حکمنامے کے یہاں کے کارندوں کو مفتاح الدولہ کے نام پر آیا۔ بمجرد پہنچے حکمنامے کے زیور بحسب ضرورت تیار ہو جائے گا، آئندہ جب خدا امید بر لائے گا دل کا اور حوصلہ بھی نکل جائے گا۔ فقط زیادہ شوق۔

راقم جان عالم المحررہ ششم ربیع الثانی ۱۲۷۲ ہجری

محبت نامہ سوم :-

ماہ لقا، مہر ضیا، پری جمال، حور تمثال، سرو قد، خورشید خد، خوبی مجسم، خجستہ شیم، نواب سلطان بیگم صاحبہ، دولت عشق سے مالا مال رہو۔ سند خورمی، اور سجل بے غمی گنجینۂ محبت اور خزینۂ مسرت یعنی مکتوب بہجت اسلوب ایک قطعہ لکھا ہوا بیسویں کا اور دوسرا قطعہ اکیسویں ربیع الآخر کا کنز الدولہ بہادر کی معرفت دونوں برابر شمع بزم وصول گلدستۂ چمن حصول ہوئے، نشۂ الفت دوبالا اور سرور الفت زیادہ ہوا۔ حکایت فراق اور قصہ اشتیاق سن کر دل مضطر سخت گھبرایا، کلیجہ منہ کو آیا۔ ہمارا حال اگر سنو ساری کہانی اپنی بھول جاؤ۔ جامع المتفرقین اس دوری کو دور کرے شادی وصل سے مسرور کرے اور حال مسافرین لندن کا کیا لکھوں۔ خیر و عافیت سے ہیں، ابھی کوئی مژدۂ روح مقوی دل نہیں حاصل ہوا جس وقت فضل خدا ہوگا یہ چرچا ہوگا۔ ہمارے لکھنے کی نوبت بھی نہ آئے گی کہ تم تک آواز جائے گی۔ برخوردار نگین آرا بیگم کو دعا کہنا۔ رقیمہ شوق (جان عالم)

۲۹ ربیع الآخر ۱۲۷۲ ہجری

محبت نامہ چہارم

محبوبۂ فرزانہ، وحید زمانہ، مہر سمائے خوبی، آفتاب محبوبی، جان عالم نواب رشید بیگم صاحبہ زاد حسنہا و محبتہا۔ خط تمہارا ہم کو ساتویں تاریخ ربیع الثانی معرفت منشی صفدر کے پہنچا اور وہ غزل جو تم نے لکھی تھی جس کا مطلع یہ ہے

خداوندا دے جلد صورت جان عالم کی
بہت ہے شاق اس شیدا کو فرقت جان عالم کی

ہم نے دیکھی اور بہت مزہ اٹھایا اور حال مفارقت نے عجب رنگ دکھایا۔ ہائے ہم اور تم سے جدا ہوں اور افسوس ہے کہ ایسی آفتوں میں مبتلا ہوں ؎

فگندہ دور ز کوئے تو نارسیدہ بکام
جفا زیادہ ازیں بخت نارسا چکند

مگر تم نے یہ جو لکھا تھا کہ نواز شاہزادی طلعم رہا سے بہ سبب رنج مہاجرت کے میں اب بیخود ہوں اور سوائے تمھارے جان و تن کی بھی خبر نہیں ہم کو دیکھو کہ علاوہ تمھاری مفارقت کے کہ یہ بھی ایک صدمۂ جانگزا ہے اور ایک سر ہزار سودا ہے لیکن تم کو نہیں بھولے، اچھا یونہی سہی۔ خیر تمھاری خوشی اور اپنے دفتر الم کو کہاں تک لکھیں غزل تو کیا دیوان میں بھی گنجائش تحریر نہیں مگر ان چند بیتوں پر قیاس کرو۔

تارے گنتے ہیں رات بھر ہم — جاگا کرتے ہیں تا سحر ہم
ہے نیند کسے کہ آکے لیٹے — لیٹے جو کبھی تو منہ لپیٹے
اٹھے جو کبھی تو رو کے اٹھے — سارے تکیے بھگو کے اٹھے

اور سنو صاحب واللہ شام سے صبح اور صبح سے پھر شام ہو جب بھی دفتر غم نہ تمام ہو

لہذا طول کو فضول سمجھکر اختصار کیا بقول تمہارے جلد جناب باری ایام جدائی کو دور کرے اور شراب وصل سے مسرور کرے۔ فقط

ہشتم جمادی الاولی ۱۲۷۲ سنہ ہجری

محبت نامہ پنجم

نواب شیدا بیگم صاحبہ کو جان عالم کی طرف سے معلوم ہو پانچ مہینے کا زمانہ مقتضی ہوتا کہ اصلاً تمہارے مزاج کی خیر و عافیت سے ہم آگاہ نہیں طبیعت بہت متشوش رہتی ہے خدا جانے میں نے تم صاحبوں کی کون سی تقصیر کی تھی کہ آج تک بیگماں بھر میں سے کسی نے ایک پرچہ کاغذ کا نہ لکھ کر بھیجا۔ رحم کرکے مفصل اپنی طبیعت کا حال لکھکر بھیجو کہ جی لگا ہوا ہے اور حمل کا بھی حال لکھ بھیجیو کہ ہے یا نہیں۔ اس میں کچھ نقصان نہیں اور یہ بھی لکھنا کہ کیا سبب جو آج تک تم نے اپنے مزاج کی خبر نہ لکھی۔ راقم

جان عالم مصیبت زدہ، دوم ذی قعدہ ۱۲۷۲ھ

محبت نامہ ششم

نواب شیدا بیگم صاحبہ کو جان عالم کی طرف سے معلوم ہو، نامہ محبت ضمیمہ، دل پذیر روح افزا پہنچا۔ نسیم کی طرح غنچہ، دل کو شگفتہ اور خاطر غمگین کو شاد و مسرور کیا۔ بما ناداں نزد دوست کو دوستاں را غذائے دل و راحت جاں فرسید۔ مقتضائے الفت و محبت یہی ہے کہ اسی طرح ارسال مکاتبات فرحت آیات سے دل غم رسیدہ فراق دیدہ کو قرین تسلی و تشفی کرتی رہو۔ جو حال ہمارا تمھارے ہجر میں رہتا ہے اس کے لکھنے سے سینۂ قلم

شتق اور رنگ چہرۂ قرطاس فق ہوتا ہے سب ہم صحبت دیکھ دیکھکر آہ سرد دلِ پُر درد سے بھرتے ہیں اشک خونین چشم گریاں سے جاری کرتے ہیں بیتاب و بے قرار ہو ہو کر درگاہ جامع المتفرقین میں یہی دعا کرتے ہیں۔ کہ الٰہی جلد جان عالم کو اس مہ پارہ سے ملادے، تماشا قران السعدین کا دکھا دے۔ گل و بلبل کی طرح صحبت نصیب ہو۔ حبیب کو حاصل وصلت حبیب ہو، خدا ان کی جلد دعا قبول کرے کہ صدمہ فراق اور رنج جدائی سے ہم نجات پائیں گویا دوبارہ حیات پائیں۔ عیش و آرام سے مطلق آگاہ نہیں ہیں۔ صبر و تحمل قابو میں واللہ نہیں ہیں۔ ہر دم یہی تمنا ہے کہ کسی طرح تم تک پہنچوں۔ گلہائے وصال سے دامن آرزو بھر لوں یقین ہے کہ مسبب الاسباب عنقریب اپنے فضل و کرم سے یہ سب سامان مہیا کر دے اور دل جس طرح چاہتا ہے آنکھوں سے بھی دکھا دے اس کی قدرت سے کچھ بعید نہیں ہے۔ راقم غریب الوطن جان عالم عفی عنہ دہم ذی حجہ سنہ ۱۲۷۲ھ۔

محبت نامہ ہفتم

نواب رشید النسا بیگم صاحبہ کو جان عالم کی طرف سے معلوم ہو۔ نظم ؎

جو گزری ہے مجھ پر کروں کیا بیاں
بہت لوگ سن کے اس کا بیاں

ستم کون سا مجھ پہ گذرا نہیں
بیاں اس کا کرنا اب اچھا نہیں

بھلا کس سے کہتا میں یہ واردات
کہاں میں کہاں ہجر ہے طرفہ بات

ہمارا تو اب کچھ نہیں دسترس
فقط غم زدوں کا ہے آنکھوں پہ بس

پڑے عشق میں دکھ اٹھاتے ہیں ہم
شب و روز آنسو بہاتے ہیں ہم

مصیبت میں اک اک گھڑی رہتے ہیں
رخِ زرد پر اشک خوں بہتے ہیں

عجب سینے میں عشق کا جوش ہے
تمہارے سوا سب فراموش ہے

نہ کھانے نہ پینے کے مجھ کو حواس
قسم لو جو بدلا ہو میں نے لباس

مگر اپنے خالق پہ ہوں میں نثار
کہ ہیں نا امید اس سے امیدوار

اسی کا ہمیشہ رکھا آسرا
اسی نے سنی میری آخر دعا

کہ خط تیرا آ پہنچا طالب کے پاس
دیا روح آ پہنچی قالب کے پاس

ہے اس دم کی گیا نیک اک گھڑی
کہ اک اک گھڑی میں خوشی ہے بڑی

بس اب بحرِ غم سے نکالو مجھے
تم اپنے گلے سے لگا لو مجھے

نہیں اور باتوں کا جو یا مزاج
گلے ملنے کی ہے فقط احتیاج

مری جاں کو اب یہی دھیان ہے
ہم آغوش ہونے کا ارمان ہے

جو ایذا اسی سے اٹھانے لگے
مزا روح دونوں کی پانے لگے

محبت کا سب حال آئینہ ہے
لبوں پر لب اور سینے پر سینہ ہے

مگر اے فلک تیرا خانہ خراب
دکھاتا ہے تو ہر زماں انقلاب

مگر چرخ کا کیا گلا کیجئے
نصیبا برا ہو تو کیا کیجئے

یہ اور ایک تازہ مصیبت ہوئی
کہ معشوق عاشق میں فرقت ہوئی

بلالو مجھے اب تم اے جانِ جاں
سنبھالو مجھے اب تم اے جانِ جاں

کدھر ڈھونڈھوں گا اور کدھر جاؤں گا
بس اب تیری فرقت میں مر جاؤں گا

نہ جلتے ہوئے بھی پکارا مجھے
غرض جیتے جی تو نے مارا مجھے

نظر میں نہ کیونکر ہو عالم سیاہ
نہاں تم ہو آنکھوں سے اے رشکِ ماہ

دلِ شاہ کا بھی بُرا حال ہے | کہ دردِ والم سے وہ پامال ہے
یہ حبب دالی شہر کو غم رہے | بپا شہر میں کیوں نہ ماتم رہے
مگر چرخ ہے درپئے انتقام | کہ کیوں دو ہوئے تھے وہاں شاد کام
فلک کا بہت تنگ ہے حوصلا | کہ دو کو بٹھاتا نہیں ایک جا
پھرا ہوں میں الفت کے میدان میں | بگولہ بنا ہوں بیابان میں
غرض تیرا اختر ہے صحرا نورد | ہر اک آنکھ ہے سرخ چہرہ ہے زرد
درختوں کو حسرت سے تکتا ہوں میں | تو دیوانہ وار ان سے بکتا ہوں میں

تمھیں میری ہو جاؤ حامی ذرا
مرے سرو کا تم بتاؤ پتا

راقم بیوطن اسیر محن جان عالم عفی عنہ ۱۲ ذیحجہ ۱۲۷۲ھ

محبت نامہ ہشتم

رشیدا بیگم کو اللہ کی امان۔ جان عالم پوچھتا ہے مزاج کیسا ہے اور اپنا تو یہ حال ہے۔ نظم:

ترے عشق میں جو گذری لکھوں کیا وہ حال اپنا
پے حسنِ خوش ادا بھی تو دکھا جمال اپنا
مری جاں مجھے الم ہے ترے دل میں عشق کم ہے
مجھے ہجر اب ستم ہے نہ ہوا وصال اپنا
اری بد مزاج دنیا مرے سر پہ تاج دینا
کوئی بوسہ آج دینا نہ چھپانا مال اپنا

مری جان کیا کیا ہے ترا دل تو بدمزہ ہے
تری زلف میں پھنسا ہے ارے بال بال اپنا
ترے رخ سے اے گلِ تر جو ہوا ہے عشق (ہم کو)
کہیں رکھ دے اے سمن بر اسی منہ پہ گال اپنا

عشق رخ نے گھلا مارا۔ شمع شب فرقت نے جلا مارا۔ انجمن تنہائی میں شمع کی طرح آنسو بہتے ہیں۔ ساتھ والے باتیں کرتے ہیں ہم چپ رہتے ہیں پیکِ عشق روز اٹھ اٹھ کر ٹھوکریں کھاتا ہے ماہ حسن یار تک جا نہیں سکتا پھر پھر آتا ہے۔ فراق نے تیری ہڈیوں کو شمع کی طرح سے جلا دیا تیل بنا کر ہر ہر رگ سے بہا دیا، گوش مشتاق کلام یار ہیں جان دینے پر تیار ہیں، آنکھیں نظارۂ جمال جہاں آرا کی یاد میں اشک فشاں ہیں تصور خال چہرہ نہیں ہے، سینہ پر سنگ گراں ہے عقیق لب تیرے دل مل مل کر لہو نکالتے ہیں ہم مہندی کی طرح پسے جاتے ہیں بدقت اپنے کو سنبھالے لیتے ہیں حسن تیرا استخوان دردرسیدہ کی تاک میں آگاہ ہوا ہے۔ ہائے ہمارا دل ہم سے کہیں دور گیا ہوا ہے لے ریزۂ الماس اب ہجر بےسود ہے وصال تیرا ہمارے لیے بیہودہ ہے۔ قسم مجھے در نجف کی کہ تو آویزۂ گوش جان عالم ہے۔

راقم جان عالم ۲۵ ذی حجہ سنہ ۱۲۷۲ھ

آغاز نامجات مرسلہ سنہ ۱۲۷۳ھ

محبت نامہ اوّل

محبوبۂ خاص، معشوقۂ با اختصاص نواب شیدا بیگم صاحبہ زاد اللہ محبتہا۔ بعد

اظہار اشتیاق ملاقات جسمانی معلوم ہو کہ محبت نامہ تمھارا عین انتظار میں غرہ محرم کو پہنچا سرور بخش دیدہ دل ہوا، مضمون سے اس کے بہت مزاجی کو حاصل ہوا۔ سنو جانی یہ شعر

دشمن کبھی اپنے دوست سے یارب جدا نہ ہو
نا آشنا بھی کوئی الم آشنا نہ ہو

کیا لکھوں کیا تمھارا بار غم فراق اٹھاتا ہوں اب سنو خود بھی رو رو کر لکھا ہے تمھیں بھی رلاتا ہوں تم کو تو میرے وہاں ہونے کی یہ خوشی ہوتی میرے دل کا حال کہو کہ مجھے اس امر کی شادی کیسی ہوتی ـــ اس تصور میں کیا دل کا حال ہوگا۔ کیا کیا جی کو ملال ہوگا، افسوس فلک نے یہ دن دکھایا۔ کہ اک زمانے کو اپنے سے بیگانہ پایا۔ ہر دم تصور اپنے سب پریزادوں کا پیش نظر ہے اس رنج میں کبھی درد دل ہے کبھی درد جگر ہے کس سے کہوں جو دل پر گزرتی ہے کیا کیا آندھی فراق محبوباں چھیڑ کرتی ہے جان من ایک دل پر کس قدر ہجوم حسرت ہے میدان غربت بدتر از صحرائے قیامت ہے حق تعالے تمھارا دل دولت فرزند سے شاد کرے تمھیں کہیں جلد بامراد کرے، تصور تو کرو جب ہمیں تمھارے زچا بننے کا خیال آوے گا دل سینے میں کیا کیا تڑپے گا، کیا کیا گھبرائے گا اور تو کچھ بس نہیں دل مسوس کر رہ جائیں گے خیر تھیں بجائے مشاطہ خیال تصور میں دولہن بنائیں گے۔ آغوش تصور میں لے کر پیار کر لیں گے۔ اسی طرح تسکین دل سے اختیار کریں گے، اپنے دُرِ اشک کی لڑیوں کا سہرا باندھ کر دیکھ لیں گے۔ لعل لخت جگر کا ہار تمھیں پہنا کر اے دلبر دیکھ لیں گے کس رنج میں یہ شادی مقدر نے دکھائی کس ہنگام میں

ہماری تمہاری ڈالی جدائی گر اے راحت جاں اس میں بڑی بڑی قدرت ہے اُس کے آگے یہ کب حقیقت ہے جو ہم کو تم سے پھر جلد تر بامراد ملائے پھر اُسی طرح تم سب کو ہمیں دکھائے، تم نے جو نقرئی مسہری کے باب میں لکھا ہے جانِ من بغیر تمہارے آئے اس کا نکلنا ممکن ہو نہیں سکتا ہے مگر فرش ضروری کے باب میں حسام الدولہ بہادر کو اور مفتاح الدولہ بہادر کو تاکید لکھدی ہے انشاء اللہ تعالیٰ تمھیں بروقت مل جائے گا۔ بہت تقیّد کی ہے لیکن تم سے عجب ہے کہ تم جورو ہو کر ہمیں عرضداشت لکھو اور آج تک ہماری مزاج داں ہو

راقم غریب الوطن رجان عالم
مبتلائے رنج و محن

محبت نامہ دوم

نواب شیدا بیگم صاحبہ، گل سرسبد بوستانِ رعنائی، غنچۂ سربستہ باغِ زیبائی، زید اللہ جمالہ۔ مثنوی تمہاری عین انتظار میں پہنچی قوت بخش جانِ غمناک ہوئی۔ ایسی بول چال اس میں تھی کہ طوطیِ عقل چہچہانے سے باز رہا سبحان اللہ مثنوی نے حیات تازہ عطا فرمائی آنکھوں میں روشنی کرامت فرمائی، ہر بیت اس کی بیت آبرو تھی، ہر سطر خوشبو تھی۔ انداز و ادا سے بھری تھی۔ مثنوی کاہے کو تھی حور تھی یا پری تھی۔ میں نے تمہارے چلنے کے سامان کو مبارک الدولہ کو بخوبی سمجھا دیا ہے یقین ہے کہ کسی طرح کی تکلیف نہ ہو اور جو کوئی امر لاحق حال ہو تو اسے صراحتاً لکھو تاکہ ابھی سے اس کے رفع کے واسطے اہلکاروں کو حکم دیا جائے اور حتی الوسع ضرور بادشاہ منزل

ہیں جاننا۔ آگے بھی لکھ چکا ہوں اور اب بھی لکھتا ہوں سامان وہی سب کرنا جو کچھ نواب بیگم نے کیا ہے قناتیں بادشاہ منزل کے واسطے نکلوا دی ہیں اور اب تم ہر وقت مجھے اپنا شیفتہ جاننا، حق تعالیٰ کے حفظ و امان میں دیا تھیں اور تمھارے پیٹ کے بچہ کو، کیا کریں دور ہیں نہیں ہزاروں حوصلے نکالتے جس طرح چاہیے تھا اسی طرح اسے پالتے، یہاں ہر گونہ فضل الٰہی ہے تباہی بادشاہی ہے تمھیں مناسب ہے کہ ارقام و ترقیم خطوط میں غفلت نہ کوتاہی نہ کرو، اور تا ملنے دولت مواصلت چشمہ خطوط جاری رکھا کرو کہ موجب ہماری تسکین ظاہری اور تشفی باطنی کا ہے اور ہم ہمیشہ تمھیں یاد کرتے ہیں۔ دل ناشاد کو آ یاد کرتے ہیں۔ اپنے جناب والد بزرگوار حسین علی خانصاحب کو اور جناب والدہ صاحبہ ماجدہ قبلہ و کعبہ کو بہت بہت میری طرف سے بصد ہزار اشتیاق معانقہ جسمانی و مصافحہ روحانی بندگی کہہ دینا۔ باقی یہاں ہر طرح فضل الٰہی ہے امید استرداد ملک شاہی ہے۔ مرقوم ۱۶ محرم الحرام ۱۲۷۳ھ

راقم جان عالم

محبت نامہ سوم

شیدا بیگم، میری جانی! جب سے ہم پر یہ آفت ناگہانی یعنی فراق نصیب ہوا۔ صورت دیکھنے کو ترستے ہیں ساون بھادوں آنکھوں سے برستے ہیں کبھی سرخ رنگ گال یاد آتے ہیں تمھارے انگریزی کپڑے پہن کر چھتری ایک ہاتھ میں لے کر گاڑی میں ہمارے ساتھ بیٹھنا یاد دلاتے ہیں ہم کلیجہ تھام

لیتے ہیں صبر اور ضبط سے کام لیتے ہیں۔ تیرھویں تاریخ ماہ صفر المظفر ۱۲۷۳ھ میں رقیمہ تو دو ضمیمہ مشعر حال اشتیاق اور فرط اضطرار عین عالم انتظار میں کپتان کنز الدولہ کی معرفت چہرہ آرائے گلگونہ مدعا ہوا۔ جان عالم اٹھ کھڑا ہوا پیشوائی کو جلد سر پر رکھا، چوما کلیجے سے لگایا۔ آنکھوں میں شدت ضبط سے پانی بھر آیا۔ جان گھبرانے لگی طبیعت سنسنانے لگی۔ دل نے کہا، الٰہی خیر ہو بس فقط حال اشتیاق ہے کہ سیر ہو، راقم کا دل دھک دھک کرنے لگا، پسینا سر کا پاؤں تک اترنے لگا، دل ڈرتا تھا۔ کہ خدا جانے کیا لکھا ہو مقدمہ تنخواہ ہے یا شکوہ زچا خانہ ہے بارے فضل خدا ہوا۔ صرف اظہار اشتیاق و وصال ہی تھا اور کچھ نہ تھا۔ سجدات شکر درگاہ جناب باری میں ہزار خوشی سے بجائے کہ اس خط میں شکوے نہ سننے میں آئے۔ مسہری کے واسطے میں نے پھر تاکید لکھی ہے انشاء اللہ چاندی کی مسہری زچا خانے کے واسطے بہت خوبصورت دستیاب ہو گی کہیں اس کے ملنے کے پہلے نہ جن بیٹھنا ہماری خاطر کرنا مسہری آ لینے دینا۔ خورد محل کو بھی لکھا ہے اور محمد حسن خواص کو بھی کہا ہے کہ تو بھی لکھ بھیج اور تم کو بھی لکھتا ہوں کہ قیصر پسند کوٹھی میں ایک مسہری چاندی کی فیل چہرہ لگی ہے مکان داروں سے کہہ کے نکلوا لینا۔ زیادہ ہم سوائے اشتیاق ملاقات اور کیا لکھیں۔ فقط مرقوم سیزدہم صفر ۱۲۷۳ھ

راقم (جان عالم)

محبت نامہ چہارم

مجمع فیوض حسن جلیلہ، منبع بتان جمیلہ، یار شکیلہ نواب شیدا بیگم صاحبہ زید اللہ الطافہا

آبیاری سحاب مکرمت اور ترشح ابر مدار محبت کو ہمراہ چمن خزاں رسیدۂ فراق لیکر
اور گلدستہ تمنائے وفاق اس معشوقہ بلبل صفت کو نذر دے کر عندلیب ترانہ
سنج مدعا کو باغستان بیان میں چھوڑتا ہوں تیز پروازی سے طوطی قلم کے پر و بال
موڑتا ہوں۔ اے گلبن باغ شادکامی اور اے نونہال چمنستان نیک نامی،
مرغ قفس کی طرح ہم تیرے ہجر میں نالہ اور فریاد کرتے ہیں۔ سرخاب کے مانند
اپنے جوڑے کو یاد کرتے ہیں سترھویں تاریخ ماہ صفر المظفر سنہ ۱۲۷۳ ہجری میں
گنز الدولہ بہادر کی معرفت تمہارا خط ضیا بخش چشم منتظر ہوا، مضمون اشتیاق اس
کا دل مشتاق پر ظاہر ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر فقرہ محبت خیز اور ہر لفظ الفت
انگیز تھا۔ سیاہی نے اس کی روشنائی چشم بڑھائی جلوۂ بیاض بین السطور میں نور
کی تجلی پائی اب تو کمال شوق ملاقات ہے دل بے تاب سے یہی بیرون حرف
و حکایات ہے اب تاثیر جذب دل دکھاؤ کشش الفت سے ہمیں جلد بلاؤ۔
اب ہجر کی راتیں کاٹے نہیں کٹتی ہیں ہماری آہ زاری سے سننے والوں کی
چھاتیاں پھٹتی ہیں۔ ہمسائے ہمارے نالۂ شبگیر سے تنگ آ گئے ہیں۔ غم خوار
روز کی بیقراری دیکھ کر گھبرا گئے ہیں تمھیں منصف ہو کہ ہمارے حال سے
آگاہی ہے ہم تو نشتر ہجر رگ جاں سے آشنا نہ تھے۔ درد مفارقت کی
لذت سے زبان دل آگاہ اصلاً نہ تھے۔ جان من، سہتے سہتے سہیں گے
خار فراق اٹھتے اٹھتے اٹھے گا بار فراق، بس اے فلک اب تاب ضبط
ایذائے فراق نہیں، دل کو تحمل کاوش خار نفاق نہیں الٰہی جلد پردۂ
مفارقت اٹھا دے جلوۂ رخ دلدار دکھا دے۔ راقم جگر ریش جان عالم الفت کیش
۱۷ صفر سنہ ۱۲۷۳ ہجری۔

محبت نامہ پنجم

حسینہ خوش ادا قمر طلعت ماہ لقا نواب شیدا بیگم صاحبہ زید اللہ جمالہا
انیسویں تاریخ نامہ عنبریں شمامہ آفتاب الدولہ بہادر کی معرفت پہنچا، ہم نے
اس کے جواب میں یہ اپنی غزل تمھارے عشق میں تحریر کی۔ غزل آخر یہ ہے

مسکرایا باغ میں تو اے گل خنداں میرے
میں تو عاشق ہوں ترے دم کا دل وجاں میرے

مصرع غیر سے ہرگز مجھے کچھ کام نہیں
مائل گوشت سگ ہوں گے نہ دنداں میرے

درد و غم رنج والم طپش و طپش عشق سے ہو
آج خاطر مری کر سینے میں مہماں میرے

آنکھ پھوڑوں گا جو آنسو نظر آیا مجھکو
کھل کے رونا نہ کہیں اے دل پنہاں میرے

اس پریزاد کے سایے سے بچانا مجھ کو
پھونک دینا نہ مجھے اے دل سوزاں میرے

غل مچاتا ہوں بڑی دیر سے اے زنداں باں
سلسلہ مجھ سے بھی رکھنا کوئی زنداں میرے

بے دھڑک محفل اغیار میں گھس جاتا ہے
پھنس نہ تو کافروں میں سیدھے مسلماں میرے

بیڑا پار ہو گئے الفت سے تری سارے عزیز
کیوں نہ چاہوں تجھے اے یوسف کنعاں میرے
سرو گڑ گڑ گئے صحبت سے زمیں پہ تیرے
قد کشی باغ میں کر ان سے گلستاں میرے
پہلی تاریخ سے مشتاق ہم آغوشی ہوں
چودھویں رات ہے مل اے مہ تاباں میرے
بے مزہ ہو گئے وہیں رشک سے جل جاتا ہے
چومتا ہے وہ اگر لعلِ بدخشاں میرے
پر لگا دیتا ہوں وحشت میں پری زادوں کے
شعر لے گئی ہیں قاف میں پریاں میرے
شاعروں سے مری زینت ہے خدا شاہد ہے
میں تو اُمّی ہوں مگر ہیں وہ سخنداں میرے
پھر سنا اخترِ خوش لہجہ ذرا اپنی غزل
پھر چہک پھر چہک اے بلبل لستاں میرے

۱۹ صفر ۱۲۷۳ ہجری راقم اختر۔ اور مبارک الدولہ کی تشفی کا حال اور بادشاہ منزل کی تجویز سب معلوم ہوئی۔

محبت نامہ ششم

مالکِ اقلیم حسن و جمال، فرمانروائے کشورِ محبت لازوال، مشتری آسمان دلبری

زہرۂ فلک برتری، نہال خیابان، خوبی سروِ جوئبار محبوبی نواب شیدا بیگم صاحبہ کو بعد تحفہ گلہائے اشتیاق اور تمنائے مواصلت کے معلوم ہو کہ خط تمھارا اکیسویں تاریخ ماہ صفر کی معرفت ماہتاب الدولہ بہادر قریب پہر دن چڑھے کے خورشید آسمان حصول اور شمس فلک وصول ہوا۔ مضامین مندرجہ اس کے از جزو تا کل سب معلوم ہوئے اور جو تم نے لکھا تھا کہ ہم کسی کے بھڑکانے میں نہیں آتے ہیں میں بھی تم کو میدان محبت و الفت میں ثابت قدم جانتا ہوں اور یہی توقع ہے کہ ہر طرح ہمارا ساتھ دوگی اور مجکو تو ہر دم تم لوگوں کے رونگٹے رونگٹے کا خیال رہتا ہے۔ اور شب و روز تمھاری ہی فکر رہتی ہے احتیاج لکھنے کی تو اس کو ہے کہ جس کو فکر نہ ہو۔ مرا حال تو خدا ہی پر روشن ہے اب خدا سے یہ امید ہے جلد تم سے ملادے تا تمنائے دلی بر آوے۔ فقط ۲۱ صفر ۱۲۷۳ھ راقم جان عالم۔

محبت نامہ ہفتم

سروِ حسینہ یار خوش قرینہ نواب شیدا بیگم صاحبہ سلامت رہو۔ اٹھائیسویں تاریخ منشی صفدر کی معرفت خط محبت نمط زخم ہجر کے لیے سوزش میں مرہم کافور ہوا۔ مرض بیتابی یک قلم دل سے دور ہوا۔ شمع شب کو جب روشن ہوتی ہے میں اپنے پروانے کی یاد کرتا ہوں، چاند جب دکھائی دیتا ہے میں اپنے چکور کے لیے فریاد کرتا ہوں، باغ جب دیکھتا ہوں اپنا بلبل ڈھونڈھتا ہوں، لالہ جب نظر آتا ہے ساتھ ہی اپنے داغ کہنہ پر آنکھ پڑتی ہے، قمری جب سامنے آجاتی ہے وہ سرو خراماں یاد آتا ہے ابر جب

دیکھتا ہوں، ہر ایک دیدۂ ترمینھ برساتا ہے ایام فراق بسر نہیں ہوتے ہیں۔ پہروں منہ ڈھانکے روتے ہیں۔ چشمۂ چشم سے ہر وقت آنسو جاری رہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ فراق محبوباں میں اپنی جان سے عاری ہیں اے فلک کیوں وہ بھی کوئی دن ہوگا کہ ہم اور وہ یار یکجا ہم پہلو ہو کر بیٹھیں گے اے جان من جان عالم یہ جدائی تمھاری نہایت دشوار ہے اپنی جان سے بیزار ہے الٰہی ہمارا یار ہم سے پھر ملے سینہ سے سینہ سر سے سر ملے اور اب تو ھذا فراق بینی و بینکم کی گفتار ہے لب پر آہ شرربار ہے دلسوزی سے تنگ آئے ہیں۔ کیا کیا کلکتے میں آن کر پچھتائے ہیں خدا تمھیں آباد رکھے کہ تمھارے یاد کرنے سے زیست ہے نہیں تو کب کے روبراہ ہو گئے ہوتے، مصرعہ 'الٰہی یاد وصل پر ہی ہو..... ہو سزاوار ہے' فراق نہیں ہے، برچھی ایک جگر کے پار ہے' حق سبحانہ تعالیٰ جلد اس بلائے جانکاہ سے نجات دے تو زندگی ہو جائے گویا دوبارہ آب حیات دے' اے مونسہ۔ ایک خط بھائی نے لندن سے بھیجا سوائے رسید اور اس میں کچھ تحریر نہ تھا اس واسطے اتنا ہی قلم بند کیا۔ امید اب ستودہ صفات سے تمھارے یہ ہے کہ مدام نگارش حال سے اس مہجور بلا نصیب کو سرفراز کیا کرنا۔ دور از مخلص نوازی نہ ہوگا رقم زدہ ۲۸ صفر ۱۲۷۳ھ ہجری راقم غریب الوطن جان عالم۔ اور غزل تمہاری ہمیں پہنچی بند کے لیے مطلع کا مصرعہ اول لکھتا ہوں سے ہجر میں تارے گنا کرتی ہوں شب بھر۔ اور میں تمہیں خاتمتاً بھیجتا ہوں۔

محبت نامہ ہشتم

مہربان عاشقہ والہ و شیفتہ نواب شیدا بیگم صاحبہ سلامت رہو۔ تیرھویں تاریخ

مہتاب الدولہ بہادر کی معرفت نمیقۂ مسرت وثیقۂ عین انتظار میں افسر فرق منتظر ہوا خط کا دل میں گھر ہوا۔ اے مہر سپہر خوبی عجب بلا میں مبتلا ہیں۔ کچھ بس نہیں امیدوار رحمت خدا ہیں۔ آج کل کب انتہائی ملال نہیں کونسی گھڑی ہے جس میں تمنائے وصال نہیں۔ خدا ایام فراق و مصیبت جلد کاٹے دشمن اپنا تھوکا آپ چاٹے ایک لحظہ غم یار جانی فراموش نہیں بندہ بار الفت سے الی الآن سبکدوش نہیں، برتری ہماری سب خاک میں مل گئی ایک ایک ہڈی درد فرقت سے گل گئی۔ صانع ازل نے ہماری تصویر انھیں صدمات کے لیے صفحۂ دنیا پر خلق کی تھی کیا انھیں مصائب کے لیے سلطنت دی تھی۔ اے میری معشوقہ امید وصل منقطع ہے قیدیوں کی طرح میری قطع ہے داڑھی بڑھی، بال پریشان دیدے تحیر سے جانب دیوار و در نگراں، انصاف خدا کے ہاتھ غیر کف کا ساتھ ہے برسوں جو خاص مکان سے نہ نکلتے ہوں وہ شدربن کے جنگل میں بردوان کی کوٹھی میں مقیم ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا عذاب عظیم ہوں۔ ماہ تاباں دیکھنے نہیں پاتا، ستاروں سے آنکھیں نہیں ملاتا۔ چہرۂ امید نے منھ چھپایا جو نہ دیکھا تھا وہ دکھایا اگر اب تک وہی جور و جفا ہے اب تک بخت ہم سے خفا ہے تم باللہ چین نہیں کون ساعت ہے جو شور و شین نہیں۔ فآہ ثم آہا ثم آہا کیا کیا نہ تڑپے کیا کیا نہ دل کڑھا۔ امید ہے کہ اس بے بال و پر یعنی بے نور (اختر) کو جب تک دم میں دم اس کے باقی ہے نہ بھولنا۔ فقط۔

رقم زدہ ربیع الاول ۱۲۷۳ھ راقم جان عالم

لڑکی تو تم سے تولد ہو چکی مگر مسہری عنقریب نکلی آتی ہے یا مل گئی ہو۔ خورد حلقل

کو بھی لکھ چکا ہوں اور کئی حکمنا نے بھجوا چکا ہوں اگر میری طرف سے اس کے دینے میں دریغ ہو تو لعنت خدا مجھ پر۔

محبت نامہ نہم

پیاری رشیدا بیگم جنیاں کو معلوم ہو دو رقعے تمہارے بھیجے ہوئے ایک میں طلب نسخہ برشفاء ہم سے اور دوسرے ——— میں ایک غزل اور احوال غلام حسین علی خاں درج تھا، کنز الدولہ بہادر کی معرفت چوتھی تاریخ ماہ حال کی ہمیں پہنچے۔ جانمن جو دوائیاں تم نے لکھی ہیں وہ تو اب عنقا صفت ہو گئی ہیں۔ ہاں حنظل غم ہر جا موجود ہے اور غزل کی تعریف میں کیا لکھوں زبان ادائے وصف میں اس کے قاصر ہے اور ذ کیا نذر کروں جان حاضر ہے مگر اے ماہ خوبی غلام حسین علی خاں کون ہیں جنھوں نے خواب دیکھا ہے اگر تمھارے باپ ہیں وہ فقط حسین علی خاں ہیں لفظ غلام شاید سہواً لکھا ہو بہر حال اس کی تصریح کر کے لکھنا۔ اور اب ہم بڑے صدمات اور آلام میں گرفتار ہیں خارش اور چھپے اور داد و دنبل اور دانوں کا نہایت زور ہے تمام بدن سرخ بانات رہتا ہے، ایک ایک دانہ میں سے پیپ اور لہو بہتا ہے لندن میں یہ حال ہے بھائی صاحب یہ چاہتے ہیں مجھے سلطنت ہو، صاحبزادے صاحب یہ چاہتے ہیں کہ مجھے ہو۔ چچا بھتیجے میں قرار واقعی جوتا کھیل رہا ہے ہم یہاں علیل پڑے ہیں ہمیں کوئی نہیں پوچھتا خدانخواستہ اگر وہاں یہی حال ہوا تو کمپنی مجھے جیتا نہ چھوڑے گی خدا جانے کیا گت اور نوبت میری ہوگی۔ اب تو یہ مدعی قرار واقعی دشمن ہو چکے ہیں مگر ائے گل خوبی افسوس رہا کہ تیری اور تیری لڑکی کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ دوسرے یہ کہ زنگمہ محل

نے[1] آسمان جاہ پر کہ کسی طرح سے اس کو مجھ سے چھین لے، نالش کی ہے۔ روز وکیل آکر ناک میں دم کرتے ہیں اور مجھ سے کہتے ہیں کہ اپنے لڑکے رشک محل کو حوالہ کرو کوئی میری فریاد نہیں سنتا۔ مجھ سے لڑکا کلیجے کا ٹکڑا نہیں دیا جاتا۔ باقی اور حال اگر سنوگی سوائے ملال کیا ہاتھ آئے گا۔ اب ہمیں زندوں میں نہ سمجھنا ہم مردوں میں ہیں برس چھ مہینے کے اور مہمان ہیں امید ہے کہ جب تک جیتا ہوں رقعہ بھیجا کرنا فقط مرقوم چہارم ربیع الاول ۱۲۷۳ھ ہجری راقم بسمل جان عالم عاشق شیدا

محبت نامہ دہم

لیلائے عراق خوبی سلمائے حجاز محبوبی طوطی چمن موانست، عندلیب گلشن مؤالفت خلاق ناز، موجد عشوہ و انداز، حور پری پیکر، آفتاب صبح محشر، بلقیس حشمت، زلیخا صورت، عذرا عذار، حوراکردار، برگزیدہ حسینان عالم نواب شیدا بیگم صاحب بالقائے دورہ شمس و قمر زیب پہلوئے اختر رہو۔ بعد شوق وصال لازوال اور آرزوئے مشاہدہ جمال باکمال خاطر محبت ذخائر پر روشن اور مبرہن ہو کہ نسیم عنبر شمیم بہشت وحدت وگلدستۂ خیاباں مودت یعنے نامۂ نامی اور صحیفہ گرامی عین انتظار اور کمال انتظار

---

[1] اپنی سلطنت کی واپسی کیلئے واجد علی شاہ نے لندن میں ایک مقدمہ دائر کیا تھا اور اس کے لئے ایک اپنے وکیل، اپنے بھائی، ایک بیٹے اور ماں کو بھی بھیجا تھا۔ قریب تھا کہ مقدمہ کامیاب ہوجائے مگر بیچ میں واجد علی شاہ کے بدخواہوں نے محسوس کیا کہ اگر مقدمہ جیت گیا تو سارا عمل دخل اس وکیل کا ہوجائے گا اور یہ لوگ اپنی ہوا کھو بیٹھیں گے چنانچہ واجد علیشاہ کو سمجھایا کہ وہاں لندن میں آپکے بھائی اور بیٹے خود اپنے حصول سلطنت کی کوشش میں ہیں آپ مقدمہ واپس لے لیجئے واجد علی شاہ کی سمجھ میں آگیا اور مقدمہ کی واپسی کی درخواست بھیج دی اس خط میں اسی غلط فہمی کا ذکر ہے۔ تفصیل کیلئے دیکھئے "گزشتہ لکھنؤ" مصنفہ شرر مرحوم۔ (نور الحسن)

میں مع غزل کہ مصرع مطلع اس کا یہ ہے ع خدا کے فضل سے ہے وہ بہار...... پہ،
چھٹی تاریخ ربیع الاول کی معرفت آفتاب الدولہ بہادر کے قوت بخشنے والا دماغ و جان
کا اور طاقت دینے والا دل ناتواں کا ہوا۔ شکایت رنج فراق دیکھ کر غم دوری دو بالا ہوا
کیفیت بیقراری بڑھ کر زخم دل آلا ہوا۔ اپنے بلوانے کے باب میں جو اشارہ کیا تھا، حال یہ
ہے کہ میرا بھی دیکھنے کو جی چاہتا تھا مگر کیا کروں بہت سے موانع ہیں کہ بلوا نہیں سکتا۔
خدا سے یہی دعا کرو کہ ہم کو بامراد تم سے ملا دے تا سب کدورتیں دفع ہوویں، مطلب
دلی بر آوے فقط مرقوم ہفتم ربیع الاول ۱۲۷۳ھ راقم جان عالم آختر

محبت نامہ یازدہم

جان من جانان من نواب شیدا بیگم صاحبہ پھولو پھلو، ساتویں تاریخ ماہ حال کی اشتیاق
نامہ خیر ختامہ کنز الدولہ بہادر کی معرفت غازہ کش چہرۂ امید اختر ہوا سب حال معلوم ہوا۔
فی الواقعی ایسا الم ہجر تو نصیب دشمناں بھی نہ ہو جو ہمیں تمھیں نصیب ہوا۔ خدا شاہد حال
ہے کہ دوری مارے ڈالتی ہے تقدیر اپنی ہوس کس کس طرح نکالتی ہے۔ اے ماہ دو ہفتہ
رو کش ہلال تجھ بن سیج سونی ہے۔ جب غور کر کے ایک ایک آنکھ سے دیکھو مصیبت دونی
ہے جتنیاں میری شیدا نواب کا حال سب دریافت ہوا، ہم مرد لوگ ہیں ہمیں اس میں
کچھ ذرا دخل نہیں۔ والدہ صاحبہ آگاہ ہیں سو وہ ہزاروں کوس دور لندن میں ہیں ہم مجبور
ہیں مگر یقین ہے کہ اگر خورد محل یا نشاط محل سے پوچھو تو کیا عجب ہے کہ انھیں اس میں تمیز
اور یاد ہو اہم نے تو یہ ڈھکے اور منتیں آج ہی تمھاری تحریر میں دیکھیں۔ بہر حال جو کچھ ہو
دیرینہ آدمیوں سے دریافت کر کے کاربند ہونا۔ مسہری بھی یقین ہے کہ پہنچ چکی ہو یا اب

پہنچ جائے گو کارندے لیت ولعل کرتے ہیں۔ مگر کیا ہوا فیل چہرہ ہی مسہری انشاء اللہ تمہارے پاس ہو گی مگر جان من وہ ایک ہی مسہری میری ہے تمہارے واسطے اور تمہاری لڑکی کے واسطے، جان تک عزیز نہیں، آج اگر برسر حکومت ہوتے تو خدا جانے کیا کیا نہ کچھ حوصلے نکالے ہوتے۔ لکھنؤ بھر کے فقیر سب روپے والے ہوتے، تقدیر میں کسی کو دخل نہیں جو مرضی خدا اب ہر طرح اپنے دل کو بشاش رکھنا۔ فقیر کیا خوشی خرمی نہیں کرتے مثل مشہور ہے جتنا اوڑھنا اتنا پاؤں پھیلانا۔ ہم تو ابھی فضل الٰہی سے مالدار ہیں اور رہیں گے تم کچھ اس کا تردد نہ کرنا۔ مناسب یہ ہے کہ اسی طرح ارقام خطوط سے مسرور کیا کرو۔ فقط۔ رقم زدہ ربیع الاول ۱۲۷۳ھ راقم پر الم جان عالم

محبت نامہ دوازدہم

عاشقہ والہ شیفتہ شیدا بیگم صاحبہ۔ بہت سلامت رہو۔ گیارہویں تاریخ ماہ حال ہدہد فرخندہ فال یعنی خبر فرحت اثر تولد شاہزادی نامدار تاریخ شہر صدر کی بمعائنہ عرضداشت برادر عزیز القدر حسام الدولہ بہادر گوش زد آخر ہوئی۔ گو مسافر ہیں مگر خوشی سے پیرہن میں نہ سمائے ہم نے برخوردار طول عمرہا کا خطاب نگین آرا نواب رقیہ بانو بیگم صاحبہ عنایت کیا حق سبحانہ وتعالیٰ مبارک ومسعود کرے اور یمن قدم سے اس نونہال باغچہ سلطنت کے استرداد ملک موروثی ہمارا بوجہ احسن جلد تر ہو۔ حاتمن موافق برخوردار سریر آرا نواب زینب بیگم صاحبہ اور تخت آرا نواب شہر بانو بیگم صاحبہ عالی اللہ عمرہا کے اس نور چشم کی بھی ماہواری تنخواہ اتنی ہی مقرر کر دی اور حکمنامہ بھی دبیر الدولہ بہادر کے نام پر اس مضمون کا بھیجا ہے خلاصہ محبوبہ

قرین اطمینان رہے اور ہماری طرف سے برخوردار موصوفہ کی دیدہ بوسی کرنا۔ فقط۔
رقمزدہ یازدہم ربیع الاول سنہ ۱۲۷۳ھ راقم جان عالم۔

محبت نامہ سیزدہم

نواب شیدا بیگم صاحبہ سلامت رہو۔ گیارھویں تاریخ آفتاب الدولہ بہادر کی معرفت خط تمہارا آیا۔ آخر کو ایسی عبارت میں گنجلک پڑگئی تھی کہ وہ نقرہ مبارک الدولہ والا میری سمجھ میں نہ آیا اور غزل بھی پہنچی جس کا مطلع کا مصرع یاددہی کے واسطے لکھتا ہوں سہ نہ ہو اگر ترے عارض کا نظارہ ؎ اور اگر بادشاہ منزل میں نہ جنی اپنے مکان میں جنی خوب کیا اور کوئی امر تو ایسا نہ تھا جس کا مطلب تمہاری سمجھ میں نہ آیا اور نہ نقل اس خط کی میرے پاس ہے فقط رقمزدہ ۱۱ ربیع الاول سنہ ۱۲۷۳ھ
راقم اثم (جان عالم) مہجور

محبت نامہ چہاردہم

رونق کی مسند کی بیٹھنے والی نواب شیدا بیگم صاحبہ سلامت رہو۔ نیدرھویں تاریخ منشی صفدر کی معرفت گلدستۂ باغ عشق یعنے خط مسرت نمط آیا۔ رنگ وفا خوب جمکایا۔ داغہائے فراق کا مرہم ہوا۔ غم دوری اس کے دیکھنے سے کچھ کم ہوا۔ جان من سبحان اللہ بس اسی طرح ہمیں یاد کیا کرو۔ اجرا رسم خطوط سے دل غم دیدہ جان عالم شاد کیا کرو۔ خدا اس کا اجر کامل دے گا۔ اور زنجیریں محرم کی آئیں تھیں ہم نے کسی کی بھیجی ہوئی نہیں پہنیں۔ منت مانی ہے کہ لکھنؤ میں آکر سب کے ہاتھوں سے

پہنوں گا۔ اور جان من حسام الدولہ بہادر اور محمد محبوب علی خاں، نواب ناظر بہادر اور لوگوں کے خطوط اور عرضداشتوں سے نظر مبارک سے گزرا کہ تم سے شاہزادی تولد ہوئی۔ تیسری تاریخ اس مہینے کی اور عجب در عجب کہ تم ساتویں تاریخ کا خط لکھتی ہو اور کوئی اشارا اور ایما اس امر کا نہیں پایا جاتا۔ مجھے خفقان ہوتا ہے یہ کیا معما ہے لازم ہے کہ جو حال واقعی ہو جلد لکھو فقط رقم زدہ پانزدہم ربیع الاول سنہ ۱۲۷۳ھ

راقم جان عالم

محبت نامہ پانزدہم

گلرخا نواب رشیدا بیگم صاحبہ سلامت رہو۔ انیسویں تاریخ اس مہینے کی کپتان کرنل الدولہ بہادر کی معرفت خط مسرت نمط مشتمل بر اظہار حال اشتیاق اور شرح سوز فراق مع قطعہ نوطرز مرصع جس کے شعر کا مصرعہ اول سند کے لیے لکھتا ہوں ؎ فیض جاری رہے مدام ترا — عین انتظار میں وارد ہوئے مرض ہجر ہوا۔ عجب ہے کسی خط میں حال مزاج نورچشمی نگین آرا نواب رقیہ بانو بیگم صاحبہ نہیں لکھتی ہو۔ یہ کیا معاملہ ہے مناسب کہ جب خط لکھا کرو ضرور بالضرور لڑکی کے مزاج کا حال بھی لکھا کرو۔ ہمیں تردد رہا کرتا ہے یا شاید میری نشانی کی جہت سے تم کو اس بچی سے بھی رشک محل کی طرح نفرت ہو گئی ہو، سوا اس کے اور کیا لکھوں کیا وجہ جو اس کا حال نہیں لکھتیں۔ باقی یہاں سب طرح فضل الٰہی ہے۔ چار مسہل میرے ہو چکے۔ ابھی عارضہ خارش میں افاقہ نہیں امید ہے کہ اسیطرح نامہ لکھا کرو۔ رقم زدہ بست و نہم ربیع الاول سنہ ۱۲۷۳ھ راقم جان عالم۔ یہ خط لکھ چکا تھا کہ اسی وقت ایک خط اور آفتاب الدولہ بہادر نے لا کر دیا۔ اس میں شرح

سوز فراق تھی۔ اور خط نسخہ امر کا جواب تھا کہ لوگ کہیں گے کہ مسیحا سے ایک مریض اچھا نہ ہو سکا۔ جان من امراض سوداوی کے علاج میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ برسوں کے بعد مریض شفا پاتے ہیں۔ یہاں تو ابھی برس دن بھی نہیں ہوا۔ جواب کی سند پہنچی، ذہن ہمارا ٹھیک تھا اور ٹوپی جو مانگتی ہو۔ میں اس رمز کو سمجھا ؎ نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول حرص کی تو کیا ملکۂ رسیتمن کی برابری اب سب صاف کرتے ہیں پہلے سے کسی کو نہ ہماری ٹوپی کا خیال آیا نہ انگرکھے کا نہ پائجامے کا۔ اب فضل الٰہی سے تم بھی بے چین ہو اور نواب نور زماں بیگم صاحبہ جنہوں نے خط پھیر دیا تھا، وہ بھی اسی امر کی طالب ہیں۔ تم صاحب لوگ یہ نہیں سمجھتی کہ دل کی بات اور بناوٹ میں زمین آسمان کا فرق ہے اور اب میں فقیر ہوں آگے سلطان تھا۔ کلاہ فقیرے کر کیا پاؤگی۔ بے سلطنت لئے ارادہ میرا لکھنؤ میں آنے کا نہیں ہے۔ ہاں اگر سلطنت نصیب ہوئی تو وصل بھی تم لوگوں کا ہوگا ورنہ نہیں تو مجھے رکاوٹ سے کیا حاصل ہے میں آپ کسی کے گھر بیٹھ جاؤں گا۔ اور عجب ہے کہ اس دوسرے خط میں بھی کچھ لڑکی کے مزاج کا حال نہ لکھا حیف ہے، خیر!

محبت نامہ شانزدہم

دلدار نواب شیدا بیگم صاحبہ (جان عالم) کی طرف سے معلوم ہو چوتھی تاریخ اس مہینے کی منشی صفدر کی معرفت خط فرحت نمط آیا۔ غزل بھی جس کے مطلع کا مصرع سند کے لیے لکھتا ہوں ؎ یا تو وہ رہتے تھے پہلو میں ہمارے اختر۔ مع شرح داستان اشتیاق اور مسہری کا ملنا اور لطف وصل اس مسہری کو دیکھ کر یاد آنا اور اظہار حال علالت مزاج

اور طلب اجازت آمد حکیم بنا دینا؟ اور افسوس کرنا ہمارے حال عارضہ پر اور قصد کرنا تمھارے والد کا اس طرف کو مشرح اور مفصل سب ہم نے پڑھا، جان من میں نے چار طبیب مقرر کر رکھے ہیں۔ شفاء الدولہ کے بھائی اور طبیب الدولہ کے بھائی اور حکیم غلام علی اور حکیم الدولہ۔ اس میں سے جسے پسند کرو اس کا معالجہ کرو۔ نیا طبیب بلوانا میرے نزدیک اچھا نہیں آگے تمھیں اختیار ہے اور تمھارے والد زنہار ادھر آنے کا قصد نہ کریں میں اب فضل الٰہی سے اچھا ہوں۔ باقی چار مسہلوں سے مجھے فراغت ہو چکی۔ اب پرہیز بھی ٹوٹ چکا مگر خارش بدستور ہے، اور صدمات فراق چند در چند ہیں جن کی شرح طول اور طویل ہے امیدوار ہوں کہ لڑکی کے مزاج کی خیر سے بھی مطلع کیا کرو یہ کیا وجہ جو اس کے مزاج کی خبر نہیں لکھتیں۔

مرقوم چہارم ربیع الثانی ۱۲۷۳ھ راقم جان عالم۔

محبت نامہ ہفتدہم

خوشنما نواب شیدا محل صاحبہ، نگین آرا رقیہ بانو بیگم صاحبہ کی سرپرست صحت اور تندرستی سے تا قیام قائم آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم سلامت باکرامت رہو، اے میری پیاری گوری گوری شیدا تیرھویں تاریخ کو اس مہینے کی جمعہ کے دن کپتان کنز الدولہ بہادر کی معرفت خط بلبل صحن گلشن میں مثل ہدہد نمایاں ہوا اسے پڑھ کر خوش دل و جان ہوا۔ سرنامہ یہ غزل تھی جس کے مطلعے کا مصرع اول سند کے لئے لکھتا ہوں۔ مصرع

گلوں میں باتیں ہوں ہیں جب شباہت جان عالم کی۔ اور باقی سب احوال من و عن معلوم ہوا۔ تم نے جو لکھا کہ ہفتہ بھر گزرا کوئی تشفی نامہ تمھارا مجھ تک نہیں پہنچا، جانی

قسم قرآن کی کوئی خط تمھارا ایسا نہیں جس کا جواب نہ لکھتا ہوں، یوں ڈاکیوں کا تصور ہوگا کہ راہ میں ڈال رکھتے ہوں گے، اور چار مسہل ہو چکے اب خارش بھی کم ہے خاطر جمع رکھو اور ماشاء اللہ غزل کیا کہنا جس سے جی چاہا کہلوا کے بھجوائی اپنے اوپر دھروائی۔ اور مسافرین لندن کا جو حال تم نے لکھا ہمیں یہ خبر نہیں معلوم جب ہم تک یہ خبر آئے گی اسی وقت کہلا بھیجیں گے اور سب فضل الٰہی ہے اسی طرح خط لکھا کرو۔ فقط مرقومہ سیزدہم ربیع الثانیہ ۱۲۷۳ھ ہجری راقم جان عالم۔ لڑکی کو ہماری طرف سے دعا کہہ دینا۔

محبت نامہ ہشتدہم

گل گلزار تمنا نواب شیدا محل صاحبہ سلامت رہو۔ چودھویں تاریخ اس مہینے کی کپتان کنز الدولہ بہادر کی معرفت نامہ عنبر ریں شمامہ فرحت بخش کاشانۂ امید ہوا۔ میرا حال اس وقت قابل دید ہوا۔ برخوردار نگین آرا نواب رقیہ بیگم صاحبہ کا اور تمہاری صحت اور تندرستی کا حال پڑھ کر نہایت دل خوش ہوا۔ حق سبحانہ تعالیٰ لے ہمارے تمھارے سائے میں صحیح و سالم رکھے، جان من فضل الٰہی سے اب میرا مزاج بھی اچھا ہے تم سے پھر ملوں یہی تمنا ہے۔ مرقومہ چہاردہم ربیع الثانیہ ۱۲۷۳ھ راقم جان عالم۔

محبت نامہ نوزدہم

ذی حوصلہ یار خوشنما نواب شیدا محل صاحبہ سلامت رہو۔ بیسویں تاریخ اس مہینے کی دو قطعہ نمیقہ مسرت وثیقہ ایک طولانی مشتمل بہ عذر شکوہ مثالیہ رشک محل اور

ٹوپی نہ بھیجنے کا کپتان کنز الدولہ کی معرفت اور دوسرا مختصر متضمن ملال عدم نوشت خط اس طرف سے منشی صفدر کی وساطت سے پہنچے۔ جان من ہم کو خدا کی قسم کوئی رقعہ تمہارا ایسا نہیں جس کا جواب نہ لکھتے ہوں یا قلم انداز کرتے ہوں مگر اثنائے راہ میں ڈاکیوں کم بختوں کے ہاتھ سے جو ڈاکہ پڑے اور تلف ہو جائیں اس کا کیا چارہ، اور دوسرے رقعہ کا جواب نہایت طویل ہے جناب باری تمہاری عفت اور عصمت کا کفیل ہے۔ سنو پیاری کوئی کسی کے دل کے اندر نہیں بیٹھا ہے خدا جانے تم نے کیا لکھا ہے جو آج تمہاری طبیعت ہم سے ہٹ جائے پھر کون بنائے بہر حال خدائے لایزال ہمیں معشوق اور تمھیں عاشق بنا رکھے ہماری محبت کے حال کو تم پر فائق بنا رکھے جس قدر تمھیں الفت ہوگی اسی قدر یہاں بھی دل کو اثر ہوگا۔ تم لکھتی ہو کہ مجھے جھوٹی باتیں نہیں بنا آتی ہیں تمھیں انصاف سے جواب دو کہ آگے تمہارے اس قدر رقعے آیا کرتے تھے جس قدر اب آتے ہیں۔ آگے تو اتنے نہ آتے تھے اور تمہاری لڑکی کے علاج کو صحت الدولہ کو حکم بھیج دیا۔ لڑکی کی عرضی بھی پہنچی۔ ۲۰ ربیع الثانیہ ۱۲۷۳ھ

راقم جان عالم

محبت نامہ بستم

حور تمثال پری جمال قمر طلعت آفتاب صورت، تاب گیسوئے خوبی، مشک نافہ محبوبی آہوئے ختن دلبری، غزال چین سروری، دلدار، وفا شعار، شیریں گفتار، کبک رفتار، نازک بدن یاسمن تن لیلی ناز، عذرا انداز نواب شیدا بیگم صاحبہ کو جان عالم تصور میں گلے لگا کر پیار کر کر یہ کہتا ہے اور گل تقریر اس طرح مہکتا ہے۔ غرہ جمادی الاولی کو چکیدہ خامہ

کرشمہ نگار یعنی نامہ عنبر بار تمھارا منشی صفدر کی معرفت پہنچا۔ غم دور ہوا۔ عاشق دور افتادہ بہت مسرور ہوا۔

من از ترانۂ ایں تازہ نغمہ بشگفتم
چو لب ز خندہ و جام از شراب و گل ز بہار

حال مندرجہ اس کا کھلا خیر و عافیت سنکر غنچۂ خاطر نسیم مسرت سے کھلا طبیبوں کے مقرر کرنے میں تم کو اختیار ہے ملازموں سے جو مزاج داں ہو اور تمھارا اس نے اکثر علاج کیا ہو اس کو علاج کے واسطے محمد محبوب علی خاں ناظر سے کہہ کر بلوا بھیجو کوئی عذر نہیں کرے گا۔ جس سے کہو گی بجان و دل قبول کرے گا اپنے والد کو جو ممانعت کی بہت اچھا کیا خدا سے دعا مانگیں کہ ہم جلد مظفر و منصور وہاں آویں جس طرح سے جی چاہتا ہے اس طرح دیکھیں۔ برخوردار نواب نگین آرا بیگم کو ہماری طرف سے دعا پہنچے زیادہ شوق وصل لکھنے میں بہت طول ہے۔ رقم زدہ غرہ جمادی الاولی ۱۲۷۳ھ راقم جان عالم۔
اور ہم نے سنا کہ تمھارے مکان سکونت میں آسیب کا خدشہ ہے اور وہ مکان اچھا نہیں ہے لہذا تم اور کسی مکان کو تجویز کر کے لکھ بھیجو تا وہاں جانے کا حکم ہو اور ہمارا تردد اور خفقان جاتا رہے۔

محبت نامہ بست و یکم

مروج نقش اتحاد، موجد مثلث وداد، پری خصال حور تمثال رنگین ادا بت باوفا نواب شیدا بیگم صاحبہ کو جان عالم غریب الدیار کی طرف سے معلوم ہو پہنچی تاریخ جمادی الاول کو دو قطعہ خط تمھارے ایک معرفت کنز الدولہ بہادر کے اور دوسرا منشی صفدر کے ہمارے

پاس پہنچے دریافت خیر و عافیت مزاج سے اطمینان ہوا۔ مگر حال نحوست مکان کا سنکر نہایت خفقان ہوا۔ بمجرد دیکھنے اس مضمون کے حکمنامہ واسطے تبدیل مکان کے حسام الدولہ بہادر کے نام پر بھیجا ہے حسب الحکم بہادر ممدوح عمل میں لائیں گے۔ اپنا حال کیا تحریر کروں فلک جفا کار کی شکایت کہاں تک تسطیر کروں، ہر روز تازہ الم ہے، نیا غم ہے۔ دریں ولا سفر کرنا نواب ملکہ سرو سہی کا گلشن ایجاد سے طرف باغ جناں قیامت سے کم نہیں وفور ملال ہے اس دن سے طبیعت کا ایک عالم نہیں، کبھی صفت ابر زار زار روتا ہوں کبھی بستر بیقراری پر عالم تنہائی میں منہ ....

....

محبت نامہ بست و ششم

سراپا ناز خوش ادا نواب شیدا بیگم صاحبہ سلامت رہو۔ تیسویں تاریخ اس مہینے کی دو قطعہ خط مسرت نمط آئے جوہر شمشیر الفت چمکائے ایک خط کے سر پر یہ غزل لکھی جس کے مطلع کا مصرع یادداشت کے لیے اور پتے کے واسطے لکھتا ہوں وہ یہ ہے ؎ کرے دماغ فلک سے دل حزیں اختر۔ الی آخرہ تھی اور دوسرا رقعہ مختصر تھا۔ کنز الدولہ بہادر نے لاکر دیئے ساغر الفت ہم نے ان دونوں خطوں سے پئے۔ جان من تم نے جو یہ شکوہ لکھا ہے کہ ایک خط میں میرے دو خطوں کی رسید دیتے ہو سنو جان من بات ایک ہی ہے کار بیکاراں سے تم جانتی ہو مجھے ہمیشہ نفرت ہے صاف صاف راست گوئی کی عادت ہے بناوٹ کر نہیں آتی ہے۔ بہت لگاوٹ سے طبیعت گھبراتی ہے تم سا نہیں ہوں کہ خواہ نخواہ لکھوں ایک ہی مضمون کو چھاپے کیطرح

دو جگہ چھاپ دو اور تم فضل الٰہی سے میرے مزاج سے ماہر ہو افسوس ہے کہ بے اعتنائی کا طعنہ ہم کو دو۔ دیکھو تو ہم کس آفت میں مبتلا ہیں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں سے جدا ہیں ہیں دن رات نہیں سوجھتے۔ طبیعت آرائی تو عیش اور سرور میں حاصل ہوتی ہے۔ یہاں ہر وقت نیش فرقت خلش زن ہے۔ لڑکی کو دعا پہنچے۔ رقم زدہ جان عالم مرقومہ
۲۳ جمادی الاول سنہ ۱۲۷۳ھ

محبت نامہ بست و ہفتم

روح رواں من، خوش ادا نواب شیدا محل صاحبہ، سلامت رہو۔ حور رفعت، سراپا نزاکت رہو۔ انتیسویں تاریخ اس مہینے کی، جلا دل کے نگینے کی یعنی ایک قطعہ خط فرحت نمط منشی صفدر کی معرفت وحی صفت آیا رنگ موافقت چمکایا۔ جان من عجیب و غریب نسخہ طلب کیا تھا۔ سو دلے حیرانی سر دست ہم کو دیا تھا۔ عجب دوائیں تھیں کہ بہت ڈھونڈا ....

....

محبت نامہ بست و ہشتم

....

.... رقیمہ نگار جان عالم زار مرقوم جمادی الثانی سنہ ۱۲۷۳ ہجری

محبت نامہ بست و نہم

نہ دارد کوتہی در ہیچ حال افسانۂ عاشق　　فغاں گر لب فرو بندد تمنا گفتگو دارد

اے میری پیاری شیدا بیگم جان عالم پُر الم تم سے اُس خوشی کو کیونکر بیان میں لاسکے جو کسی کے قیاس میں نہ آسکے۔ تین خط تمھارے دل و جان و جگر سے پیارے ۸ رجمادی الثانی کو منشی صفدر کی معرفت ایک دن آئے اور تو کیا کہوں وصل کے مزے اٹھائے، سو سو دفعہ پڑھا۔ مکتوب وصل را دلم از شوق ہمچو طفل صد بار خواندہ و دگر از سر گرفتہ است۔ واللہ کیا فقرے دلفریب تھے کہ جن کو پڑھ کر ہم باشکیب تھی ساری تمھاری صورت دلکش آنکھوں میں پھر گئی تصویر غم طاق چشم سے صورت اشک گر گئی صبر جا گزین دل پاش پاش ہوا جی نہایت بشاش ہوا۔ خط کیا پڑھا گویا تم سے دو دو باتیں کیں، سفیدی کاغذ نے آسان ہجر کی راتیں کیں، دو نامے زرد تھے، یا میرا غم مٹانے کو دونوں وحید و فرد تھے۔ اسی طرح ہمیشہ اپنی تحریر حالات سے تا مراجعت ہماری شاد کیا کرو، اور ہم کو رنج تنہائی سے آزاد کیا کرو۔ فقط نامہ نگار جان عالم زار۔ مرقومہ جمادی الثانی ۱۲۷۳ھ

محبت نامہ سی ام

محک امتحان، نوجوان، خوش ادا نواب شیدا محل صاحبہ۔ باغ عالم میں ہری بھری رہو باخوشی اور خورمی رہو۔ نامہ عنبر بیں شامہ نویں تاریخ اس مہینے کی جیسے دانگ الماس کے نگینے کی منشی صفدر کی معرفت بہار صفت آیا صبح کو آنکھ کھلتے ہی نقش مراد دکھایا۔ جان من مکان کی ناپائداری کا حال پڑھ کر ملال ہوا دل شکستہ تو تھا ہی اور بھی ٹوٹ گیا رنج کمال ہوا واقعی شرف المکان بالمکین ہوتا ہے بے باغباں باغ درست نہیں ہوتا ہی اے مایہ عیش ....

علمِ عروض صوتی اعتبار سے

[علمِ عروض ہمارے طلبا اور اکثر شعرا کے لئے دردِ سر کا باعث رہا ہے۔ اس کے قواعد اور اصول تقریباً علمِ ریاضی کے اصول پر ہوتے ہیں۔ اور ریاضی سے شعرا اور ذہین طلبا عموماً گھبراتے ہیں اسی لئے علمِ عروض کی طرف توجہ نہیں دے پاتے۔ شعر قند و نبات سے بہتر کہتے ہیں مگر فاعلاتن فاعلات کی وجہ سے چکرا جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے قواعد کچھ پیچیدہ ہیں لیکن اگر ذرا توجہ دی جائے تو سب حل ہو جاتے ہیں، دراصل علمِ عروض کا تعلق آواز سے ہے نہ کہ تحریر سے، آوازوں ہی کو ترتیب دینے کا نام علمِ عروض ہے۔ شعر میں نغمہ درحقیقت اسی آواز کی ترتیب سے پیدا ہوتا ہے۔ گویا علمِ عروض ایک واسطہ ہے شعر کا علمِ موسیقی سے۔ موسیقیت اشعار میں پیدا نہیں ہو سکتی جب تک ان میں آواز کا ترنم کسی خاص صوتی ترتیب کے ماتحت نہ ہو۔

ہمارے عروضیوں نے علمِ عروض کے سلسلے میں یہ بات تو تسلیم کی کہ ملفوظی الفاظ لائقِ اعتبار سمجھے جائیں گے اور مکتوبی نہیں۔ لیکن انھوں نے تلفظ کو واضح کرنے کے لئے اور آوازوں کی حرکت اور سکون کو تمیز کرنے کے لئے الفاظ اور ارکان کی جو قسمیں اور اصطلاحیں وضع کیں ان سے بڑی پیچیدگیاں پڑ گئیں

اور یہ علم بہت دشوار ہو گیا۔ اگر ملفوظی حرکات کو صوتی شکلوں میں پیش کیا جاتا تو اتنی زیادہ دقت نہ پیش آتی لیکن غالباً اس وقت یہ ممکن نہ تھا۔ اس مضمون میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ صوتی لحاظ سے عروض کو پیش کیا جائے اس میں انگریزی ادبیات کے علم عروض سے بھی مدد لی گئی ہے اور طلباء پر تجربہ کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ اگر علم عروض کو اس طریقہ پر ان کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ بہت جلد اُسے سمجھ جاتے ہیں۔

آخر میں یہ بات اور عرض کرتی ہے کہ اگرچہ علم عروض کو یہاں صوتی انداز سے پیش کیا گیا ہے لیکن ارکان اور بحروں اور زحافات کے نام وہی رکھے ہیں جو ہمارے یہاں اب تک رائج ہیں کسی اصلاح کی کوشش فی الحال نہیں کی گئی ہے اور زیادہ تر وہی بحریں اور زحافات پیش کئے گئے ہیں جو ہماری اردو شعر و شاعری میں عموماً مستعمل ہیں۔]

اردو علم عروض ہو یا انگریزی دونوں میں یہ بات مشترک ہے کہ وہی الفاظ لائق اعتبار سمجھے جاتے ہیں یعنی تقطیع میں لائے جاتے ہیں، جو زبان سے ادا ہوں اور تلفظ میں آئیں وہ نہیں جو صرف تحریر میں آئیں یہ الفاظ دیگر آواز پر توجہ دی جاتی ہے نہ کہ تحریر پر۔ آوازیں عموماً دو طرح کی ہوتی ہیں ایک وہ جو ہماری زبان یا گلے سے مفصل اور مکمل نکلے اور دوسری وہ جو مختصر یا نامکمل نکلے، مثلاً فقرہ "آ گیا"، کو اگر ہم پڑھیں تو منہ سے لفظ "آ" تو پورا اور مکمل نکلے گا "گ" مختصر اور پھر "یا" مکمل۔ اسی طرح لفظ "تماشا" اگر منہ سے نکالیں تو "ت" مختصر طور پر یا ادھورا ادا ہوگا "ما" اور "شا" پورے طور پر ادا ہوں گے، اسی طرح ہر لفظ یا فقرہ مشتمل

ہوتا ہے۔ مکمل یا مختصر یا پوری یا ادھوری آواز دل پر۔ اب اگر ہم مکمل آواز کے لئے نشان (–) مقرر کردیں اور مختصر آواز کے لئے نشان (٨) تو فقرہ "آگیا" کی شکل یہ ہوگی (– ٨ –) اور لفظ "تماشا" اس طور پر ظاہر کیا جاسکے گا (٨ – –) وغیرہ وغیرہ

ہماری زبان میں ایک طرح کے الفاظ اور ہوتے ہیں یعنی وہ جن کا آخری حرف ساکن ہوتا ہے مثلاً خیال، گلزار، جہاں، کہیں، نہیں وغیرہ۔ ان سب میں آخر کا حرف ساکن ہے۔ ایسے حروف کے لئے ہم نشان (٧) مقرر کئے دیتے ہیں تو گویا الفاظ کے اعتبار سے تین طرح کی شکلیں ہوئیں (۱) مکمل (۲) مختصر یا نامکمل (۳) ساکن۔ جن کی شکلیں علی الترتیب یہ ہیں (–)، (٨)، (٧)۔ اب اگر کسی مصرع کی صوتی شکل پیش کرنا چاہیں تو اس قسم کے نشانات سے بہ آسانی ظاہر کی جاسکتی ہے۔ مثلاً

مطرب خوش نوا بگو تازہ بہ تازہ نو بہ نو

= مط رِ ب خُش، نَ وا بہ گو، تا زہ بہ تا زَہ نو بہ نَو،

= – ٨ ٨ – ٨ – ٨ – ، ٨٨ – ، ٨ – ٨ – ،

اس مصرع میں لفظ "تازہ" کی لکھی ہوئی شکل تو مکمل ہے لیکن "زہ" کا ٹکڑا زبان سے ادا کرنے میں دب کر نکلتا ہے، اس لئے اس کے لئے مختصر علامت دی گئی ہے یہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ آواز کی نوعیت ذہن میں رکھنی چاہیئے نہ کہ تحریر کی نوعیت۔ لیکن الفاظ اور حروف کی نوعیت کس طرح ذہن میں رہے تاکہ شعر ٹھیک ٹھیک موزوں پڑھا جاسکے۔ اس کے کچھ قاعدے ہمارے عروضیوں نے مقرر کردیئے ہیں ان کو پیش نظر رکھنے سے یہ واضح ہو جائے گا کہ لکھے ہوئے حروف کو کس طرح ادا کیا جائے تاکہ ان کی آوازیں ٹھیک ٹھیک ادا ہوں اور اُن کی

تقطیع آسانی سے کی جاسکے، وہ قاعدے یہ ہیں۔

۱۔ حرف الف :۔ اگر مصرعہ میں اس طرح آئے کہ اس سے قبل کا حرف اس کے بعد کے حرف سے ملتا ہوا معلوم ہو تو ایسا الف تقطیع میں شمار نہ ہوگا۔ مثلاً اس مصرعہ ؎ "اب اِس داستاں کو سنا چاہیئے" میں "اِس" کا الف 'ب' اور 'س' کے ساتھ اس طرح پڑھا جائے گا۔ "آبِس داستا کو سنا چاہیے"۔

۲۔ ں :۔ نون غنہ جو کسی حرف علت (ا، و، ی) کے بعد واقع ہو اور بشرطیکہ مصرعوں کے آخر (عروض و ضرب) میں نہ ہو تو تقطیع سے خارج ہوگا۔ جیسے اوپر والے مصرع میں لفظ 'داستاں' کا نون غنہ۔ اسی طرح تمام معروف نون غنہ والے الفاظ مثلاً 'میں'، 'ہیں'، 'وہاں'، 'جہاں'، 'کہاں'، 'کہیں'، 'ہوں'، 'نہیں' وغیرہ کے نون غنہ تقطیع میں شمار نہ ہونگے[1]

۳۔ و :۔ واؤ معدولہ تلفظ میں نہیں آتی ہے اس لیئے تقطیع سے خارج تصور ہوگی مثلاً خواب = خاب، خوش = خُش۔

۴۔ ہ :۔ ہائے مختفی جو کسی کے لفظ کے آخر میں آتی ہے جیسے جامہ، نامہ، وہ، کہ وغیرہ میں، اگر بیچ شعر میں آئے گی تو ساقط ہوگی۔ مصرع کے آخر میں آئے گی تو حرف ساکن متصور رہوگی۔

۵۔ و :۔ واؤ عطف :۔ اس کو اکثر محض پیش (ضمہ) سمجھا جاتا ہے، جیسے "جان و دل" = جانُ دل۔ ایسا واؤ تقطیع میں خارج متصور ہوگا۔ لیکن اگر ضمہ خوب دراز ہو

---

[1] قاعدہ سے اس طرح کا نون غنہ جو مصرعوں کے آخر میں آئے اُسے بھی تقطیع سے خارج جاننا چاہیئے۔ لیکن ہمارے عروضیوں نے اسے پورا نون غنہ شمار کیا ہے۔ یہاں اس مضمون میں اُنھیں کی تقلید کی گئی ہے اور اصلاح کی کوشش نہیں کی گئی۔ ن

جیسے "علم و ہنر و فضل و کسب و کمال" میں تو شمار ہوگا، اگر واؤ کسی لفظ کے زبر (فتحہ) سے ملفوظ ہوگا جیسے ؎ ہے قدر کسی کی تو وطن میں ہے وگرنہ" میں۔ اس صورت میں بھی تقطیع میں شمار ہوگا۔

۶۔ **حروف مخلوط** :۔ جو ساتھ ملا کر بولے جائیں مثلاً 'کیا' میں 'ے' اور 'گھر' میں 'ھ'۔ یہ شمار نہ ہوں گے بلکہ 'کا' اور 'گر' پڑھے جائیں گے۔

۷۔ **ال** :۔ عربی کا "ال" تقطیع میں داخل نہیں ہے مثلاً 'الشمس' یا 'بالضرور' میں کیونکہ ایسے 'ال' پڑھنے میں نہیں آتے'

۸ **حروف ساکن** :۔ اگر وسط مصرع میں دو ساکن ایک جگہ آجائیں تو پہلے ساکن کو قائم رکھتے ہیں اور دوسرے کو متحرک کر لیتے ہیں مثلاً ؎ "خیر تو ہے آپ کہاں جاتے ہیں"۔ اس میں 'خیر کی 'ے' تو برقرار رہی اور 'ر' متحرک ہو جائے گی کیونکہ وہ پڑھنے میں واضح رہتی ہے۔

۹۔ اگر وسط شعر میں حروف ساکن دو سے زیادہ ہوں تو اول ساکن بحال رہے گا، دوسرا متحرک ہو جائے گا۔ تیسرا دور کر دیا جائے گا۔ جیسے "راست کہتا ہوں اس کو سچ جانو" اس میں 'راست' 'راس' پڑھا جائے گا اور اگر آخر مصرع میں تین ساکن جمع ہوں گے تب بھی دو ساکن بحال رہیں گے اور تیسرا دور ہو جائے گا۔ مثلاً ؎ "وابستہ ہے تجھ سے اپنی یاں زیست" اس کو یوں پڑھا جائے گا "وابستہ تجھس اپ نِ یاز یس"۔ مختصر یہ کہ تین ساکن اوزان میں کبھی جمع نہیں ہوتے۔

۔ بعض الفاظ تلفظ میں تو آتے ہیں لیکن تحریر میں نہیں آتے مثلاً آمد = اامد، یا طاؤس = طاووس اسی طرح حرف مشدد اور تنوین مثلاً خرّم = خُر رَم، 'نوراً = نورن'، زیر (کسرہ) اگر کھینچ کر پڑھا جائے تو وہ بھی ایک حرف شمار ہوگا مثلاً زیرِ فلک، کو اگر زیرے فلک پڑھا جائے تو زیر کی کسرہ بھی تقطیع میں شمار ہوگی۔

۱۱۔ حروف علت (ا، و، ی) بعض اوقات الفاظ کے ساتھ اس طرح آتے ہیں کہ ان کا تلفظ بہت مختصر ہوتا ہے ایسی صورت میں ان کے ماقبل کی حرکت تقطیع میں شمار ہوگی۔ مثلاً "مجھ کو تھا اس شخص سے بس اتحاد" اس مصرع میں "کو" "تھا" اور "سے" کے حروف علت شمار نہ ہوں گے۔

۱۲۔ اکثر جگہ رکن بحر میں سکون ہوتا ہے اور شعر میں اس جگہ متحرک ہوتا ہے تو اس کو بالضرورت تقطیع میں ساکن کر لیتے ہیں۔ مثلاً ؎ تم نے بات نہ میری مانی۔ اس مصرع میں "بات نہ" کو "باتن" پڑھیں گے۔ بروزن فَعِلُن۔

خلاصہ یہ ہے کہ تقطیع میں صرف وہی الفاظ شمار کئے جاتے ہیں جو زبان سے نکلیں اور اسی قدر شمار کئے جاتے ہیں جس قدر کہ وہ زبان سے ادا ہوں یعنی (۔ ہ یا ۲۔) لکھے وہ چاہے جیسے ہوں۔

تقطیع کرنے کے لئے تلفظ کے اصول اور آوازوں کی تین قسمیں جاننے کے بعد اب یہ بتانا ضروری ہے کہ ہماری شاعری میں یہ نہیں ہوتا کہ ان آوازوں کو فرداً فرداً پیش نظر رکھیں بلکہ ان آوازوں کے کچھ مجموعے بنا لئے جاتے ہیں اور تقطیع کرنے میں یہی آوازوں کے مجموعے شمار میں رکھے جاتے ہیں۔ یہ مجموعے ہمارے قدیم عروضیوں نے متعین کئے ہیں۔ ہر مجموعہ دو، تین، چار، یا پانچ آوازوں کی شرکت پر مشتمل ہوتا ہے۔ آوازوں کے اس قسم کے مجموعے کو 'رکن' کہتے ہیں۔ اور ان ارکان کو چند بے معنی الفاظ مثلاً فاعلن یا فاعلاتن وغیرہ سے ظاہر کرتے ہیں تاکہ ان الفاظ کے تلفظ سے آوازوں کے حرکات اور سکون ٹھیک ٹھیک ظاہر ہو جائیں۔ مثلاً فاعِلُن کی شکل یہ ہوگی (۔ ہ ۔) فاعلاتن

کی آوازوں کا مجموعہ اس طرح ظاہر ہو سکے گا۔ (ــ ۸ ــ ــ) وغیرہ وغیرہ۔ یہ بے معنی الفاظ یا ارکان تعداد میں کل دس ہیں[لہ] (۱) مُتَفاعِلُن (۸ ۸ ــ ۸ ــ) (۲) مُفاعِلَتُن (۸ ــ ۸ ۸ ــ) (۳) مُفاعِیلُن (۸ ــ ــ ــ) (۴) فاعِلاتُن (ــ ۸ ــ ــ) (۵) فاع لاتن (ــ ۷ ــ ــ) (۶) مُسْتَفعِلُن (ــ ــ ۸ ــ) (۷) مستفع لن (ــ ــ ۷ ــ) (۸) مَفعُولاتُ (ــ ــ ــ ۸) (۹) فعولُن (۸ ــ ــ) (۱۰) فاعِلُن (ــ ۸ ــ) انھیں ارکان میں سے جب کوئی ایک رکن یا آوازوں کا مجموعہ کسی مصرعے یا شعر میں متواتر آتا ہے تو اسے نامزد کر دیتے ہیں کہ یہ فلاں نام کی بحر ہے یعنی اصطلاح میں کسی ایک مجموعے کی تکرار کو بحر کہتے ہیں۔ گویا وہ شعر ایک سمندر ہے جس میں کسی خاص صوتی ترتیب کی لہریں اٹھ رہی ہوں۔

بحروں کی کل تعداد انیس[لہ] ہے اور وہ اس طرح پر ہیں۔

نام بحر	پرانی لفظی علامت جس کو رکن کہتے ہیں	تعداد آواز لفظ	علامت صوتی
۱۔ کامل	مُتَفاعِلُن	(پانچ آوازی لفظ)	۸ ۸ ــ ۸ ــ
		پہلی اور چوتھی آواز مختصر، دوسری تیسری اور پانچویں مکمل	
۲۔ وافر	مُفاعِلَتُن	(پانچ آوازی لفظ)	۸ ــ ۸ ۸ ــ
		پہلی تیسری اور چوتھی آواز مختصر، دوسری اور پانچویں مکمل	
۳۔ ہَزَج	مُفاعِیلُن	(چار آوازی لفظ)	۸ ــ ــ ــ
		پہلی آواز مختصر اور بعد کی تین مکمل	

لہ۔ لیکن ہماری اردو شعر و شاعری میں صرف چھ ارکان عموماً مستعمل ہیں۔ ارکان ۲ و ۸ شاذ ہی استعمال کیے گئے ہیں۔ ۵ و ۷ بھی بہت کم۔ ن

۴۔ رَمَل فاعِلاتُن یا فاعِ لاتُن (چار آوازی لفظ [ــ ـ ــ ــ])

پہلی آواز مکمل، دوسری مختصر، یا ساکن، تیسری اور چوتھی مکمل

۵۔ رَجَز مُستفعِلُن یا مُستَفعِ لُن (چار آوازی لفظ) {ــ ــ ـ ــ}

پہلی دو آوازیں مکمل تیسری مختصر یا ساکن اور چوتھی مکمل

۶۔ مُتقارِب فَعولُن (سہ آوازی لفظ) (ـ ــ ــ)

پہلی آواز مختصر، دوسری اور تیسری مکمل

۷۔ مُتدارِک فاعِلُن (سہ آوازی لفظ) (ــ ـ ــ)

دوسری آواز مختصر، پہلی اور تیسری مکمل

یہ سات بحریں ایک ہی مقررہ رکن مندرجہ بالا (یا اس کی کچھ بگڑی ہوئی صورت یعنی زحاف [۱]) سے بنتی ہیں مثلاً بحر ہزج میں رکن مفاعیلن ہی کسی مصرعہ میں دو یا تین یا چار بار آئے گا [۲] اس لئے ان سات بحروں کو ہم مفرد بحریں کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ ایک ہی رکن کی تکرار سے بنتی ہیں۔ بقیہ بارہ بحریں انہی مندرجہ بالا ارکان کو دو دو یا تین تین ملا کر ایک مرکب بحر بنا لیتے ہیں اور اس کا ایک نام رکھ دیتے ہیں ذیل میں بقیہ بارہ مرکب بحریں

---

[۱] زحافوں کا بیان آگے آئے گا۔ [۲] اگر کسی مصرع میں تین ہی رکن ہوں تو دونوں مصرعوں میں ملا کر چھ ہوئے اس لئے ایسی بحر کو مسدس کہتے ہیں اور اگر ایک مصرعہ میں چار رکن ہوں تو دونوں مصرعوں میں ملا کر آٹھ ہوئے ایسی بحر کو مثمن کہتے ہیں۔ تین رکن سے کم اور چار سے زیادہ عموماً کسی بحر میں نہیں آتے۔ بعض دفعہ اس سے کم یا زیادہ بھی استعمال کئے جاتے ہیں دو ہوں تو مربع کہتے ہیں، آٹھ ہوں تو سولہ رکنی وغیرہ وغیرہ۔

لکھی جاتی ہیں۔

۸۔ مُضارع:۔ مفاعیلن، فاعلاتن مفاعیلن فاعلاتن

مثمن

- - ^ - ، - - - ^ ، - - ^ - ، - - - ^

۹۔ قریب:۔ مفاعیلن مفاعیلن فاعلاتن

مسدس

- - ^ - ، - - - ^ ، - - - ^

۱۰۔ مُشاکل:۔ فاعلاتن مفاعیلن مفاعیلن

مسدس

- - - ^ ، - - - ^ ، - - ^ -

۱۱۔ جدید:۔ فاعلاتن فاعلاتن مستفعلن

مسدس

- ^ - - ، - - ^ - ، - - ^ -

۱۲۔ خفیف:۔ فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن

مسدس

- - - ^ - ، - ^ - - ، - - ^ -

۱۳۔ مُجتث: مستفعلن فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن

مثمن

- - ^ - ، - ^ - - ، - - ^ - ، - ^ - -

۱۴۔ بسیط: مستفعلن فاعلن مستفعلن فاعلن

مثمن

- ^ - ، - ^ - - ، - ^ - ، - ^ - -

۱۵۔ طویل: فعولن مفاعیلن فعولن مفاعیلن

مثمن

- - - ^ ، - - ^ ، - - - ^ ، - - ^

۱۶۔ مدید: فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن

مثمن

- ^ - ، - - ^ - ، - ^ - ، - - ^ -

۱۷۔ مُنسرح :- مستفعلن مفعولاتُ، مستفعلن مفعولات

مثمن ـ ـ ۸ ـ ، ـ ـ ـ ۸ ، ـ ـ ـ ۸ ـ ، ـ ـ ـ ۸

۱۸۔ مُقتَضِب :- مفعولاتُ مستفعلن مفعولاتُ مستفعلن

مثمن ـ ـ ـ ۸ ، ـ ـ ۸ ـ ، ـ ـ ـ ۸ ، ـ ـ ۸ ـ

۱۹۔ سریع :- مستفعلن مستفعلن مفعولات

مسدس ـ ـ ۸ ـ ، ـ ـ ۸ ـ ، ـ ـ ـ ۸

لیکن ان انیس بحروں میں سے ہماری اردو شاعری میں صرف گیارہ بحریں مستعمل ہوتی ہیں بقیہ نہیں ہوتیں کیونکہ ان میں ترنم واضح نہیں ہے اور ہمارے کانوں میں وہ نثر جیسی معلوم ہوتی ہیں یہ گیارہ بحریں جو ہماری اردو شاعری میں عموماً استعمال ہوتی ہیں درج ذیل ہیں۔

(۱) کامِل (۲) ہَزَج (۳) رَمَل (۴) رَجَز (۵) مُتقارب (۶) مُتدارک (۷) مُجتث۔ (۸) سریع (۹) مُنسرح (۱۰) مُضارع (۱۱) خفیف۔

اگر کوئی رکن کسی مصرع میں دو یا تین یا چار یا آٹھ دفعہ پورا پورا استعمال ہو جائے تو ایسی بحر کو سالم، کہتے ہیں مثلاً

۱۔ ہَزَج ترا شکوہ، بجا ہم او، ستم ایجا، د کیا کرتے

مفاعیلن چار دفعہ ـ ۸ ـ ـ ، ـ ۸ ـ ـ ، ـ ۸ ـ ـ ، ـ ۸ ـ ـ

اس بحر کو ہم بحر ہزج مثمن سالم، کہیں گے۔ اسی طرح

۲۔ رَجَز مثمن سالم وہ باوفا، کہنے لگے، مٹنے کا یہ، حاصل ہوا

(مستفعلن چار بار) ـ ـ ۸ ـ ، ـ ـ ۸ ـ ، ـ ـ ۸ ـ ، ـ ـ ۸ ـ

۳۔ کامل مثمن سالم (متفاعلن چار دفعہ)

شبِ غم کی ہائے وہ بے کلی، کہ تڑپ تڑپ کے سحر ہوئی

۸۸-۸-، ۸۸-۸-، ۸۸-۸-، ۸۸-۸-،

۴۔ متدارک سالم (فاعلن چار دفعہ)

مٹ گئے، عشق میں، امتحاں، ہو چکا

-۸-، -۸-، -۸-، -۸-،

۵۔ متقارب مثمن سالم (فعولن چار دفعہ)

مقدر، سے بدلے، مقدر، کسی کا

۸--، ۸--، ۸--، ۸--

اردو شعر میں صرف مندرجہ بالا بحریں ہی سالم استعمال ہوتی ہیں یعنی اُن میں پورے پورے ارکان عموماً تین یا چار دفعہ ایک مصرع میں مستعمل ہوتے ہیں اور بقیہ بحریں خواہ مفرد ہوں یا مرکب عموماً سالم استعمال نہیں ہوتیں یعنی ارکان پورے پورے استعمال نہیں ہوتے گھٹ یا بڑھ جاتے ہیں۔

زحافات:۔ اور اگر یہ رکن پورے پورے استعمال نہ ہوں تو اس کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔ (۱) یا تو کسی آواز میں تبدیلی ہو جائے گی یعنی مکمل آواز (-) مختصر (۸) یا ساکن (۷) ہو جائے گی۔ (۲) کوئی ایک یا دو آوازیں پورے رکن سے گھٹ جائیں گی مثلاً فاعلاتن (-۸--) کی آواز مختصر ہو کر فاعلا (-۸-) رہ جائے گی (اسے فاعلا کے بجائے فاعلن کہتے ہیں۔ حالانکہ فاعلن ایک بحر یعنی متدارک کا نام بھی ہے۔ اِس التباس سے شروع شروع میں کچھ دشواری سمجھنے

میں محسوس ہوتی ہے لیکن یہ یاد رکھئے کہ "فاعلن" اگر کسی بڑے رکن مثلاً فاعلاتن مستفعلن وغیرہ کے ساتھ آئے تو زحاف ہوگا۔ اور تنہا آئے تو بحر متدارک شمار ہوگا)، یعنی آخر کی ایک مکمل آواز (-) کم ہوجائے یا (۲) کوئی ایک آواز کسی قسم کی پوری رکن سے بڑھ جائے مثلاً متفاعلن (٨٨-٨-) سے متفاعلاتن (٨٨-٨--) ہوجائے (لیکن یہ آخری تیسری صورت ہمارے یہاں اُردو شاعری میں شاذ ہی برتی جاتی ہے اس لئے اسے ہم یہاں نظر انداز کریں گے) ان سب صورتوں کو کہتے ہیں کہ رکن میں "زحاف" آگیا۔ یا بحر مزاحف ہوگئی [۱]۔ پورے علم عروض میں مفرد اور مرکب زحافوں کی تعداد تو تقریباً اڑتالیس ہے لیکن اُردو شاعری میں عموماً پندرہ سولہ زحافات کام میں آتے ہیں۔ اگر صرف یہ زحاف یاد ہوجائیں تو بقیہ کے جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے [۲]۔

---

[۱] ۔ لفظ زحاف کے لغوی معنی ہیں تیر کا نشانہ پر پہنچنے سے پہلے گر پڑنا۔ [۲] اور جو لوگ ان پندرہ سولہ زحافات کو بھی یاد نہ کرنا چاہیں وہ صرف بحروں کے نام یاد کرلیں اور انھیں پہچاننا جان لیں اور اگر کسی بحر میں زحاف آجائے تو وہ اس کی تقطیع اتنا لکھ کر سکتے ہیں کہ یہ فلاں بحر مع زحاف ہے مثلاً ذیل کے شعر کی تقطیع وہ صرف یہ لکھ کر سکتے ہیں کہ یہ بحر ہزج مع زحاف ہے

لو رو ٹھ گیا کوئی اب دیکھئے کیا ہوگا

مفعولُ مفاعیلن مفعولُ مفاعیلن

- ــ ٨ ا ٨ ــ ٨ ــ ا ــ ــ ٨ ا ٨ ---

ذیل میں ان زحافات کی صوتی صورتیں پیش کی جاتی ہیں جو اردو شاعری میں عموماً مستعمل ہیں۔ صوتی اعتبار سے انھیں تقسیم کرنا ان کو جاننے اور پہچاننے میں بڑی مدد دیتا ہے۔

(الف) وہ صورتیں جن میں رکن تو پورا استعمال ہوتا ہے لیکن کسی ایک یا دو آوازوں کی شکل بدل جاتی ہے۔

۱۔ مسبّغ :۔ جب کسی رکن کے آخر میں مکمل آواز (-) ہو اس پر ساکن (۳) کا اضافہ ہو جائے مثلاً

مفاعیلن (۸ - - -) سے مفاعیلان (۸ - - - ۷)

فعولن (۸ - -) سے فعولان (۸ - - ۷)

فاعلاتن (- ۸ - -) سے فاعلاتان (- ۸ - - ۷) اسے فاعلیان کے لفظ سے بدل دیتے ہیں۔

نوٹ :۔ یہ جائز ہے کہ شعر کا ایک مصرعہ سالم ہو اور دوسرا مسبّغ [1]

۲۔ مکفوف :۔ جب کسی رکن کی آخری آواز مکمل (-) ہو اور وہ مختصر (۸) ہو جائے۔ مثلاً

مفاعیلن (۸ - - -) سے مُفاعیلُ (۸ - - ۸)

مُستفعِلن (- - ۸ -) سے مُستفعِلُ (- - ۸ ۸)

فاعِلاتن (- ۸ - -) سے فاعِلاتُ (- ۸ - ۸)

---

[1] صرف اُن صورتوں میں جب مصرعوں کے آخر کا نون غنہ تقطیع میں شمار کیا جائے۔ (دیکھو نوٹ صفحہ ۱۹۷) اور اگر اسے شمار نہ کیا جائے تو یہ اجازت صرف مزاحف اور مرکب بحروں تک محدود ہوگی سالم بحروں میں نہیں۔ ن

٣۔ مخبون :۔ جب کسی رکن کی پہلی مکمل آواز (-) مختصر (٨) ہو جائے۔

مثلاً مستفعلن (- - ٨ -) سے مُتَفعِلُن (٨ - ٨ -) = اسے مفاعِلُن شمار کرتے ہیں۔

فاعلاتن (- ٨ - -) سے فَعِلاتن (٨ ٨ - -)

فاعلن (- ٨ -) سے فَعِلن (٨ ٨ -)

٤۔ مطوّی :۔ جب کسی رکن کی دوسری مکمل آواز (-) مختصر (٨) ہو جائے۔

مثلاً مستفعلن (- - ٨ -) سے مُستَعِلُن (- ٨ ٨ -) = اسے مُفتَعِلُن کہتے ہیں

٥۔ مقبوض :۔ جب کسی رکن کی تیسری مکمل آواز (-) مختصر (٨) ہو جائے۔

مثلاً فعولن (٨ - -) سے فعولُ (٨ - ٨)

مفاعیلن (٨ - - -) سے مفاعِلُن (٨ - ٨ -)

٦۔ مشکول :۔ جب کسی رکن کی پہلی اور آخری مکمل آوازیں (-) مختصر (٨) ہو جائیں

مثلاً فاعلاتن (- ٨ - -) سے فَعِلاتُ (٨ ٨ - ٨)

مستفعلن (- - ٨ -) سے مُتَفعِلُ (٨ - ٨ ٨) = مُفاعِلُ

٧۔ مقصور :۔ جب کسی رکن کے آخر کی مکمل آواز (-) ساکن (٧) ہو جائے۔

مثلاً مفاعیلن (٨ - - -) سے مفاعیل (٨ - - ٧)

فاعلاتن (- ٨ - -) سے فاعلات (- ٨ - ٧)

فعولن (٨ - -) سے فعول (٨ - ٧)

(ب) وہ صورتیں جن میں آواز گھٹ جاتی ہے یا گھٹنے کے بعد بقیہ آوازوں میں کچھ تبدیلی ہو جاتی ہے۔

۸۔ محذوف:- جب کسی رکن کے آخر میں دو مکمل آوازیں (--) ہوں ان میں سے ایک گھٹ جائے اور صرف ایک باقی رہ جائے۔

مثلاً فعولن (ہ--) سے فعو (ہ-) = فَعَل

مفاعیلن (ہ---) سے مفاعی یا فعولن (ہ--)

۹۔ مقطوع[1]:- جب کسی رکن کے آخر کی دو آوازیں اس طرح ہوں کہ آخری مکمل ہو اور اُس سے پہلی مختصر (ہ-) اور ان میں سے مکمل آواز گر جائے اور بقیہ مختصر مکمل ہو جائے۔

مثلاً۔ فاعلن (-ہ-) سے فاعے یا فعلُن (--)

مستفعلن (--ہ-) سے مُس تفعے یا مفعولن (---)

مُتفاعِلن (ہہ-ہ-) سے مُتفاعے یا فَعِلاتن (ہہ--) وغیرہ

۱۰۔ مُسکّن:- جب کسی رکن کی تمام آوازیں گر کر صرف دو مکمل آوازیں (--) رہ جائیں مثلاً فاعلاتن (-ہ--) سے فعلُن (--)

فاعلن (-ہ-) سے فعلن (--) وغیرہ

---

[1] اثلم اور مقطوع کی وہ شکل جو فعلن بن جاتی ہے یہ سب مسکّن بھی کہے جا سکتے ہیں بعض عروضی مسکّن کی جگہ مقطوع ہی لکھتے ہیں ورنہ ان سب صورتوں کو صرف مسکّن لکھا جا سکتا ہے۔ اثلم کی تشریح کے متعلق دوسرا صفحہ ملاحظہ کیجیے۔ ن

۱۱- ابتر :- جب کسی رکن سے تمام آوازیں گر کر صرف ایک مکمل آواز فع (-) یا ساکن فاع (-٧) رہ جائے مثلاً

فعولن (٨--) سے فع (-) یا فاع (-٧)

(ج) وہ صورتیں جو خاص خاص بحروں کے ساتھ مخصوص ہیں۔

۱۲- اخرب :- جب بحر ہزج میں مفاعیلن (٨---) کی شکل مفعولُ (--٨) ہو جائے۔

۱۳- اُشتر :- " " " " فاعِلُن (-٨-) "

۱۴- اَثلم :- جب بحر متقارب میں فعولن (٨--) کی شکل فعْلُن (--) ہو جائے۔

۱۵- اثرم :- " " " " " فعلُ (-٨) "

۱۶- مکسوف[ل] :- جب بحر منسرح اور سریع میں مفعولاتُ (---٨) کی شکل فاعلن (-٨-) یا فاعلات (-٨-٧) ہو جائے۔

اب ذیل میں ان تمام بحروں کی مثالیں مع زحافات پیش کی جاتی ہیں جو اردو شاعری میں عموماً مستعمل ہیں۔ اگر یہ فہرست پیش نظر رہے تو طلباء کو تقطیع کرنے میں بڑی سہولت رہے گی۔ مزید مشق کے لئے علم عروض کی مستند کتابوں میں پیش کردہ مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

مثالیں :-

۱- بحر کامل مثمن سالم (متَفاعلن ٨٨-٨- ۴ بار)

ل یہاں میں نے مکسوف، مکشوف اور موقوف سب کو ملا کر صرف ایک نام مکسوف رکھ دیا ہے۔ ن

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وُ جُ ہم مِ تم مِ قَ را ر تا ، تُمِ یا دَ ہو ، کِ نَ یا دَ ہو ،

۸۸ ـ ۸ ـ ، ۸۸ ـ ۸ ـ ، ۸۸ ـ ۸ ـ ، ۸۸ ـ ۸ ـ ،

بحر کامل مثمن مسبّغ

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں [1]

کَ بِ اے حَ قی ، قَ تِ مُن تَ ظر ، نَ ظ رَ آ لِ با ، سِ مَ جا ز مے

۸۸ ـ ۸ ـ ، ۸۸ ـ ۸ ـ ، ۸۸ ـ ۸ ـ ، ۸۸ ـ ۸ ـ ۷

۲۔ رجز مثمن سالم (مستفعلن ـ ـ ۸ ـ ۴ بار)

وہ یادِ فا ، کہنے لگے ، مٹنے کا یہ ، حاصل ہوا

وہ یا دِ فا ، کہنے لَ گے ، مٹنے کَ یہ ، حاصل ہُ وا

ـ ـ ۸ ـ ، ـ ـ ۸ ـ ، ـ ـ ۸ ـ ، ـ ـ ۸ ـ ،

رجز مثمن مسبّغ (آخری رکن مستفعلان)

تیری ثنا کب ہو سکے اے خسروِ والا نگاہ

رجز مثمن مخبون مطوی (مفتعلن مفاعلن ـ ۸۸ ـ ، ۸ ـ ۸ ـ)

میں اسے یاد آؤں گا وہ مجھے یاد آئے گا

مِ اُسے یا ، دِ آ ؤ گا ، وہ مُجِ یا ، دِ آئیگا

ـ ۸۸ ـ ، ۸ ـ ۸ ـ ، ـ ۸۸ ـ ، ۸ ـ ۸ ـ ،

رجز مخبون مطوی مسبّغ (مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلان)

---

[1] دیکھئے نوٹ صفحہ ۲۱۱

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خواب ناز میں[1]

تا نَ پ ڑے ، خ لل ک ہی ، آ پَ کِ خا ، ب نا زِ مے

ـ ہ ہ ـ

ـ ہ ـ ہ ـ ، ہ ـ ہ ہ ـ ، ہ ـ ہ ـ ہ ـ ۷

یا

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز (مفتعلن مفاعلان - مکرر)

۳- ہزج مثمن سالم (مفاعیلن ہ ـ ـ ـ چار بار)

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا

م را سی نا ، ہَ مشرق آ ، فَ تا بے دا ، غِ ہجرن کا

ہ ـ ـ ـ ، ہ ـ ـ ـ ، ہ ـ ـ ـ ، ہ ـ ـ ـ ،

ہزج مثمن (آخری رکن مفاعیلان)

بھلا تا لا ، کہ ہوں لیکن ، وہ اکثر یاد آتے ہیں[1]

(ہ ـ ـ ـ ، ہ ـ ـ ـ ، ہ ـ ـ ـ ، ہ ـ ـ ۷)

ہزج مثمن مقبوض (مفاعِلن ہ ـ ہ ـ چار بار)

اُٹھے جو بزمِ یار سے تو درد نے بٹھا دیا

ہزج اخرب (مفعولُ مفاعیلن مفعولُ، مفاعیلن ـ ـ ہ ، ہ ـ ـ ـ ، ـ ـ ہ ، ہ ـ ـ ـ ،

لو روٹھ گیا کوئی اب دیکھیے کیا ہوگا

لو رُو ٹَ ، گَ یا کو ئی ، اب دے کَ ، یے کا ہوگا ،

ـ ـ ہ ، ہ ـ ـ ـ ، ـ ـ ہ ، ہ ـ ـ ـ ،

---

[1] بعض عروضی آخر مصرع میں آنے والے نون غنہ کو شمار نہیں کرتے اس صورت میں یہ بحر مسبغ نہ کہی جائے گی بلکہ سالم شمار ہو گی۔ ن

ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف (مفعولُ، مفاعیلُ، مفاعیلُ، فعولن)

– – ^ ، ^ – – ^ ، ^ – – ^ ، ^ – –)

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے

غم کا نِ، مِ بودا دِ، لِ ناکا مَ، بَ ہت ہے

– – ^ ، ^ – – ^ ، ^ – – ^ ، ^ – – ،

ہزج مثمن اشتر (فاعِلن مفاعیلن فاعِلن مفاعیلن

– ^ – ، ^ – – – دو بار)

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا

عش ق سے، طبیعت نے، زیس کا، مزا پایا

– ^ – ، ^ – – – ، – ^ – ، ^ – – – ،

ہزج مسدس محذوف (مفاعیلن، مفاعیلن، فعولن ^ – – – ، ^ – – – ، ^ – –)

جس انسان کو سگِ دنیا نہ پایا

جِ سنا کو، سَ گے دنیا، نَ پایا

^ – – – ، ^ – – – ، ^ – – ،

ہزج مسدس مقبوض محذوف (مفعولُ مفاعِلن فعولن – – ^ ، ^ – ^ – ، ^ – –)

طوفاں مری چشم تر سے اٹھا

طوفا مِ، رِ چش مِ تر، سِ اٹ ٹھا

– – ^ ، ^ – ^ – ، ^ – – ،

۴۔ رمل مثمن محذوف (فاعلاتن فاعلاتن فاعِلن)

پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے

پُوْلَ تو دو، دن بَ ہا رے، جاں فَ زا دِکْ، لاگَ اے

- ^ - - ، - ^ - - ، - ^ - - ، - ^ -

رَمَل مثمن مخبون محذوف (فاعلاتن، فَعِلاتن، فَعِلاتن، فَعِلُن)

- ^ - - ، ^ ^ - - ، ^ ^ - - ، ^ ^ -)

نکتہ چیں ہے، غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے

رَمَل مثمن مخبون محذوف مسکن (فاعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلُن)

- ^ - - ، ^ ^ - - ، ^ ^ - - ، - -)

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

رَمَل مثمن مشکول (فَعِلاتُ، فاعلاتن، فعلاتُ، فاعلاتن)

^ ^ - ^ ، - ^ - - ، ^ ^ - ^ ، - ^ - -)

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

وُ ہِ ذب ح، بِی کَ رے ہے، وُ ہِ لے ثَ، وا بُ اُل ٹا

^ ^ - ^ ، - ^ - - ، ^ ^ - ^ ، - ^ - - ،

رَمَل مسدس محذوف (فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن)

- ^ - - ، - ^ - - ، - ^ -)

دل مرا اُس پر نکلتا ہی رہا

رَمَل مسدس مخبون محذوف (فاعلاتن، فعلاتن، فعلن)

- ^ - - ، ^ ^ - - ، ^ ^ -)

وہ ستم کر کے پشیماں نہ ہوا

رمل مسدس مجنون محذوف مسکن (فاعلاتن، فعلاتن، فعلن یا فعلان،
- ۸ - -، ۸ ۸ - -، - - یا - - ۲)

اُن کی باتیں ہیں ستم کی باتیں

۵۔ بحر متدارک مثمن سالم (فاعلن - ۸ - چار بار)

مٹ گئے عشق میں امتحاں ہو چکا

بحر متدارک مجنون (فعلن ۸ ۸ - چار بار)

کبھی وعدہ کسی کا وفا نہ ہوا

بحر متدارک مجنون مسکن (فعلن - - چار بار)

آنسو کوئی نکلا ہوتا

بحر متدارک مجنون ۱۶ رکنی (فعلن ۸ ۸ - ۱۶ مرتبہ)

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

بحر متدارک مجنون مسکن ۱۶ رکنی (فعلن - - ۱۶ مرتبہ)

فرقت میں کیا گزری دل پر تم نے یہ تو پوچھا تو ہوتا

۶۔ بحر متقارب مثمن سالم (فعولن ۸ - - چار بار)

جو اس شور سے میر روتا رہے گا تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

بحر متقارب مثمن مسبغ (آخری رکن فعولان ۸ - - ۷)

کلیجے سے ان کو لگائے ہوئے ہیں

بحر متقارب مثمن محذوف (آخری رکن مختصر ہو کر فعل (۸ -) رہ جائے)

شب وصل ضد میں بسر ہو گئی

بحر متقارب مثمن مقصور (آخری رکن کی شکل فعول (۸-۷) ہو جائے

وہ نالے ہیں جن میں اثر کچھ نہیں

یا

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور

بحر متقارب مثمن اثرم (فَعْلُ، فعولن -۸، ۸-- دو بار)

درد ہمارا کیا وہ سُنے گا

بحر متقارب مثمن اثرم ۱۶ رکنی

دے کے جِلا آئینۂ دل کو نور کیا ہے شیر خدا نے

بحر متقارب مثمن اثلم (فعلُن، فعولن -- ۸-- دو بار)

آخر نہ اس نے پیکاں نکالا

بحر متقارب مثمن اثلم مسبغ (فعلن، فعولن، فعلن، فعولان)

روٹھے ہوئے دل کو کیوں کر منائیں

بحر متقارب مقبوض اثلم ۱۶ رکنی (فعول، فعلن یا فعولان (۸--، ۸-- چار بار)

سدا ہے اُس آہ و چشم تر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

متقارب مقبوض اثرم محذوف ۱۶ رکنی (

فعلُن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلُ، فعولن، فعلُ، فعَل)

--، --، --، --، -۸-، --، ۸--، -۸-، ۸

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

متقارب مثمن اثلم ابتر (فعلن، فعلن فعلن فاع (--، --، --، -۷)

مجھ کو مت بہکانا آج

متقارب مثمن اثلم (فعلن، فعلن، فعلن، فعلن (--، --، --، --)

شمعِ مجلس پانی پانی

(نوٹ) اس بحر کے مختصر اوزان کا خلط ملط بھی جائز ہے یعنی ایک مصرع میں فعلُن چار مرتبہ آئے دوسرے میں فعلُ فعولن، فعلن فعلن ہو جائے وغیرہ۔

۷۔ مجتث مثمن مخبون محذوف (مفاعلن فعلاتن مفاعلن، فعِلن)

(۸-۸-، ۸۸--، ۸-۸-، ۸۸-)

تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

مجتث مثمن مخبون مقصور (مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعِلان

(۸-۸-، ۸۸--، ۸-۸-، ۸۸-۷)

کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

مجتث مثمن مخبون محذوف مسکن (مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن

(۸-۸-، ۸۸--، ۸-۸-، --)

کسی کی بزم سے ہم ہو کے سرخرو آئے

مجتث مثمن مخبون مقصور مسکن (مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلان

(۸-۸-، ۸۸--، ۸-۸-، --۷)

تمہارے چاہنے والے کمال کرتے ہیں

۸۔ مضارع مثمن اخرب (مفعولُ، فاعلاتن، مفعولُ، فاعلاتن

(--۸، -۸--، --۸، -۸--)

ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

مضارع مثمن اخرب مسبغ (مفعولُ فاعلاتن مفعولُ فاعلیّان

(- - ٨ ، - ٨ - - ، - - ٨ ، - ٨ - - ٧)

ظلم انتہا کے ہم پر ہوتے ہیں ابتدا میں

مضارع مثمن مکفوف محذوف (مفعولُ، فاعلات، مفاعیل، فاعلن

(- - ٨ ، - ٨ - ٨ ، ٨ ، ٨ - - ٨ ، - ٨ -)

مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے

مضارع مثمن مکفوف مقصور (مفعولُ فاعلاتُ، مفاعیلُ فاعلان

(- - ٨ ، - ٨ - ٨ ، ٨ - - ٨ ، - ٨ - ٢)

چٹکی بھی خوب لیتے ہیں وہ دلربا بھی ہیں

۹۔ منسرح مطوی مکسوف (مفتعلن، فاعلن، مفتعلن، فاعلن

(- ٨ ٨ - ، - ٨ - ، - ٨ ٨ - ، - ٨ -)

اب دل مضطر مرا یار کے قابو میں ہے

منسرح مثمن مطوی موقوف (مفتعلن فاعلن، مفتعلن، فاعلان

(- ٨ ٨ - ، - ٨ - ، - ٨ ٨ - ، - ٨ - ٢)

آئے گی تاثیر بھی نالۂ شب گیر میں

۱۰۔ خفیف مسدس مخبون محذوف (فاعلاتن مفاعلن، فَعِلُن

(- ٨ - - ، ٨ - ٨ - ، ٨ ٨ -)

درد منت کشِ دوا نہ ہوا

خفیف مسدس مخبون مقصور (فاعلاتن، مفاعلن، فُعِلان)

(- ٨ - - ، - ٨ - ٨ ، ٨ ٨ - ۷)

وہ فراق اور وہ وصال کہاں

خفیف مسدس مخبون محذوف مسکن (فاعلاتن مفاعلن، فعلن)

(- ٨ - - ، ٨ - ٨ - ، - -)

کوئی امید بر نہیں آتی

خفیف مسدس مخبون مقصور مسکن (فاعلاتن، مفاعلن فعلان)

(- ٨ - - ، ٨ - ٨ - ، - -)

ہم بھی ہیں تیرے جاں نثار دل میں

١١- سریع مسدس مطوی مکسوف (مفتعلن مفتعلن، فاعلن)

(- ٨ ٨ - ، - ٨ ٨ - ، - ٨ -)

میر بھی شام اپنی سحر کر گیا

سریع مسدس مطوی موقوف (مفتعلن، مفتعلن فاعلان)

(- ٨ ٨ - ، - ٨ ٨ - ، - ٨ - ۷)

دیکھ فلک وصل کے سامان ہیں

مثنوی تقطیع کے عام اصول بتانے کے بعد دو ایک ضروری باتیں مثنویوں اور رباعیوں کے متعلق بھی بیان کر دینا ضروری ہیں، ہمارے شاعروں نے تجربہ کے بعد یہ محسوس کیا کہ مثنویوں کے لئے چند بحریں اپنی روانی کی وجہ سے خوب

کام آتی ہیں۔ اس لئے ہمارے عروضیوں نے اُن کو مثنویوں کے لئے مخصوص کر دیا ہے اور اب عموماً انھیں بحروں میں مثنویاں کہی جاتی ہیں۔ وہ بحریں یہ ہیں۔

۱۔ ہزج مسدس اخرب مقبوض: مفعولُ مفاعلُن مفاعیل یا فعولن۔ فیضی کی نلدمن۔ نظامی کی لیلیٰ مجنوں۔ نسیم کی گلزار نسیم اسی بحر میں لکھی گئی ہیں مثال ؎

شبنم کے سوا چرانے والا

۲۔ ہزج مسدس محذوف: مفاعیلن مفاعیلن، مفاعیل یا فعولن۔ نظامی کی شیریں خسرو۔ جامی کی یوسف زلیخا۔ مثال ؎

نہیں کوئی برائی سر سے پا تک

۳۔ رمل مسدس مقصور: فاعلاتن فاعلاتن فاعلن یا فاعلات۔ رومی کی مثنوی معنوی، عطار کی منطق الطیر، میر کی مثنوی ہولی آصف الدولہ اسی میں لکھی گئی ہیں مثال ؎ ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر

۴۔ رمل مسدس مخبون: فاعلاتن، فعلاتن، فعلن یا فعلات:۔ جامی کی سبحۃ الابرار مثال ؎ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

۵۔ سریع مسدس مطوی: مُفتعِلن مُفتعِلن، فاعلن یا فاعلان: نظامی کی مخزن الاسرار وغیرہ مثال ؎ ہست کلید در گنج حکیم

۶۔ سریع مسدس مطوی مقطوع: فعلُ فعولُن، فعلن فع یا فاع؛ میر کی مثنوی جوش عشق مثال ؎ ضبط کروں میں کب تک آہ

۷۔ خفیف مسدس محذوف: فاعلاتن مفاعلن فعلن یا فعلات: شوق لکھنوی کی مثنوی زہر عشق۔ میر کی مثنوی دریائے عشق مثال:۔

پان کل کے لئے بناتے جائیں

۸۔ متقارب مثمن مقصور :۔ فعولن فعولن فعولن فعول یا فُعَل :۔ میر کی مثنوی شعلۂ شوق یا مثنوی در بیان ہولی مثال ؎

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور

رباعی اسی طرح رباعی کے لئے بھی چوبیس بحریں مخصوص کر دی گئی ہیں۔ یہ سب بحریں بحر ہزج سے اخذ کی گئی ہیں۔ اس طرح پر کہ ان کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں۔ پہلی یارہ تو وہ جن کے پہلے رُکن میں ہزج اخرب مفعولُ (− − ۸) ضرور آتا ہے اور دوسری یارہ وہ جن کے پہلے رُکن میں ہزج اخرم (مفعولن − − −) ضرور آتا ہے۔ بقیہ ارکان دونوں قسموں میں بحر ہزج ہی کے مختلف مزاحف ٹکڑے ہوتے ہیں۔ ذرا سی مشق سے یہ بخوبی یاد ہو سکتے ہیں۔ یہاں ہر دو قسموں یا شجروں کے ارکان درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

شجرۂ اخرب

۱۔ مفعولُ مفاعلُن مفاعیلُ فُعَل ۔ (− − ۸، ۸ − ۸ −، ۸ − − ۸، ۸ −)

۲۔ " " " فعول ۔ (− − ۸، ۸ − ۸ −، ۸ − − ۸، ۸ − ۷)

۳۔ مفعولُ مفاعلن مفاعیلن فع ۔ (− − ۸، ۸ − ۸ −، ۸ − − −، −)

۴۔ " " " فاع (− − ۸، ۸ − ۸ −، ۸ − − −، − ۷)

۵۔ مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فُعَل ۔ (− − ۸، ۸ − − ۸، ۸ − − ۸، ۸ −)

۶۔ " " " فعول ۔ (− − ۸، ۸ − − ۸، ۸ − − ۸، ۸ − ۷)

۷۔ مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلن فع ۔ (− − ۸، ۸ − − ۸، ۸ − − −، −)

۸۔ " " " فاع ۔ (− − ۸، ۸ − − ۸، ۸ − − −، − ۷)

۹۔ مفعولُ مفاعیلُن مفعولُ فُعَل ۔ (– – ۸ ، ۸ – – – ، – – ۸ ، ۸ –)

۱۰ " " فعول ۔ (– – ۸ ، ۸ – – – ، – ۸ ، ۸ – ۷)

۱۱۔ مفعولُ مفاعیلُن مفعولُن فع ۔ (– – ۸ ، ۸ – – – ، – – – ، –)

۱۲ " " " فاع ۔ (– – ۸ ، ۸ – – – ، – – – ، – ۷)

شجرۂ اخرم

۱۔ مفعولن فاعلن مفاعیلُ فعل ۔ (– – – ، – ۸ – ، ۸ – – ۸ ، ۸ –)

۲۔ " " " فعول ۔ (– – – ، – ۸ – ، ۸ – – ۸ ، ۸ – ۷)

۳۔ " " مفاعیلن فع ۔ (– – – ، – ۸ – ، ۸ – – – ، –)

۴۔ " " " فاع ۔ (– – – ، – ۸ – ، ۸ – – – ، – ۷)

۵۔ مفعولن مفعولُ مفاعیلُ فُعل ۔ (– – – ، – – ۸ ، ۸ – – ۸ ، ۸ –)

۶۔ " " " فعولُ ۔ (– – – ، – – ۸ ، ۸ – – ۸ ، ۸ – ۷)

۷۔ " " مفاعیلن فع ۔ (– – – ، – – ۸ ، ۸ – – – ، –)

۸۔ " " " فاع ۔ (– – – ، – – ۸ ، ۸ – – – ، – ۷)

۹۔ " مفعولُن مفعولُ فُعلُ ۔ (– – – ، – – – ، – – ۸ ، ۸ –)

۱۰۔ " " " فعول ۔ (– – – ، – – – ، – – ۸ ، ۸ – ۷)

۱۱۔ " " مفعولن فع ۔ (– – – ، – – – ، – – – ، –)

۱۲۔ " " " فاع ۔ (– – – ، – – – ، – – – ، – ۷)

رباعی کی یہ چوبیس صورتیں ایک وزن کے حکم میں شمار کی جاتی ہیں۔
یعنی رباعی کے چاروں مصرعے خواہ ایک صورت کے مطابق ہوں خواہ علیحدہ علیحدہ

صورتوں کے ہوں۔ مگر وہ کسی ایک شجرہ کی کسی صورت کے مطابق ضرور ہوں یعنی حتی الامکان ایک شجرہ کے مصرعے کے ساتھ دوسرے شجرہ کا مصرع نہ موزوں کریں۔

اب چند رباعیاں درج کی جاتی ہیں۔ ان کی تقطیع کرکے دیکھیئے۔

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں
یا معدن کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں
(انیس)

ناداں کہوں دل کو کہ خردمند کہوں
یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں
اک روز خدا کو منہ دکھانا ہے دبیر
کس منہ سے میں بندوں کو خداوند کہوں
(دبیر)

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن
خس خانہ و برف و آب کہاں سے لاؤں
غالب

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو　　روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا　　ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

حالی

ہماری شائع کردہ کتابیں خرید فرمائیے

۱۔ ہمارا گاؤں افسانے سید علی عباس حسینی ۳/-
۲۔ چوتھی بہن افسانے مسیح الحسن رضوی ۲/۱۲
۳۔ ابوالخمر :۔ مجنوں گورکھپوری -/۶

مزاحیہ

۱۔ زستیوں کا بادشاہ :۔ علی عباس حسینی ۳/-
۲۔ اپنی موج میں :۔ آدارہ ۱/۸
۳۔ کف گلفروش :۔ غلام احمد فرقت ۳/-
۴۔ صید و ہدف جدید مجموعہ " ۳/-

منظومات

۱۔ ذوق جنوں :۔ آل احمد سرور ۳/۸
۲۔ جوئے رواں :۔ حامد اللہ افسر ۲/۸
۳۔ ثنائے حبیب :۔ بہزاد لکھنوی ۱/۱۲
۴۔ اچھی نظمیں :۔ اخگر مشتاق -/۵

آرڈر صاف اور خوشخط لکھئے :۔

۱۔ بیسیہ اور پرچھائیں :۔ ڈاکٹر محمد حسن ۲/۸
۲۔ راکھی :۔ شجاعت علی سندیلوی -/۶
۳۔ مصنوعی بیٹا -/۱۰

تاریخ

۱۔ شاہان مالوہ :۔ امیر احمد علوی ۱/-
۲۔ داستان تاریخ زوال بنی اسرائیل " ۲/۸

سیر و سیاحت

۱۔ ساحل و سمندر :۔ پروفیسر احتشام حسین ۴/۸
۲۔ ڈھائی ہفتہ پاکستان میں :۔ عبدالماجد ۲/-

متفرق

۱۔ ارض القرآن :۔ مولانا عبدالماجد ۱/۴
۲۔ گاندھی جی کے ساتھ :۔ حامد اللہ افسر ۱/۸
۳۔ اپنی پہچان :۔ اعجاز فاروقی ۱/-
۴۔ طالب علم کی زندگی کا کیا مقصد ہونا چاہیے :۔ غلام الثقلین -/۴/-

پتہ
ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳۷۔ امین آباد لکھنؤ اتر پردیش